بھولی ہوئی کہانیاں
منشی تیرتھ رام فیروز

بھولی ہوئی کہانیاں

بارہ بلند پایہ منتخب افسانوں کا مجموعہ

اُردو کے مایۂ ناز ادیبوں کے قلم سے

مصنّف
بارہ مختلف اصحاب

مؤلف
تیرتھ رام فیروزپوری

جین بُک سٹال

لاہور

پہلی بار

قیمت عار

پیش لفظ

فی زمانہ اردو میں مختصر افسانوں کی دھوم ہے۔ کسی اخبار، رسالہ یا کتاب کو ہاتھ میں لے کر دیکھئے۔ کہانیوں کا مجموعہ ہوگا۔ یہ رو تھوڑے عرصہ سے چلی ہے۔ ورنہ چند سال پیشتر جب زمانہ، مخزن، ادیب، ترجمان، العصر وغیرہ رسائل شائع ہوتے تھے۔ تو ان میں صرف گاہ بگاہ ایک آدھ کہانی اس قسم کی درج ہوا کرتی تھی۔ جو کسی گہرے سوال کو لے کر یا عمیق غور و خوض کے بعد لکھی گئی ہو اب نہ رسالوں کا وہ اگلا دور باقی ہے۔ نہ وہ مضمون ہی نظر آتے ہیں جو اس زمانہ کے افسانوں کا مرکزی خیال ہوتے تھے۔ اس گذرے ہوئے زمانہ کی یہ چند بھولی ہوئی کہانیاں جن کے مصنف زیادہ تر ایسے اصحاب تھے جنہوں نے اپنی عمر میں ایک یا چند ایک سے زیادہ افسانے نہ لکھے ہوں گے صرف آمد اور آورد کا فرق واضح کرنے کے خیال سے پیش کی جاتی ہیں۔ یہی اس مختصر مجموعہ کی اشاعت کا واحد مقصد ہے۔

تیرتھ رام

۱۱۳۱-رام گلی نمبر ۸ لاہور

فہرست

دولت کا دھوکا

۱

دولت دنیا کی سب سے بڑی نعمت خیال کی جاتی ہے حتیٰ کہ کسی شاعر نے زر کو "رب" اور "قاضی الحاجات" کہا ہے۔ لیکن مجھ کو یقین ہے کہ اس کی یہ عظمت اور بڑائی انہیں لوگوں نے کی ہے جو اس کی صورت دیکھنے کو ترستے ہیں۔ شعرا اور علماء اس کی برکات کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ انہیں کبھی اس کا تجربہ نہیں ہوا۔ حق یہ ہے کہ دولت کی زیادتی انسان کے لئے وبال جان ہو جاتی ہے تم میری ہی حالت کا اندازہ کرو یکا یک اس قدر دولت میرے ہاتھ آئی کہ راتھ شیلڈ۔ جیکولڈ اور کارنیگی کی متفقہ دولت اس کے سامنے ہیچ تھی بشداد کے خیالی بہشت کے جواہرات کے خزانہ کو بھی اس کے ساتھ کوئی نسبت نہ تھی۔ کیونکہ میری دولت پندرہ ارب روپیہ یعنی ۱۵۰۰۰۰۰۰۰۰ تھی!

ذرا اس کثیر دولت کا خیال کرو۔ اگر تم اس کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ تو جانے دو۔ صرف اتنا سمجھ لو کہ اگر اس دولت پر تین فی صدی سود لیا جاتا تو ۴۵ کروڑ روپیہ سالانہ ۲ لاکھ ۳۰ ہزار روپیہ روزانہ ۵۱ ہزار ۳۶۰ روپیہ فی گھنٹہ یا ۸۵۵ روپیہ فی منٹ اس کی آمدنی ہوتی اُفوہ! یہ کثیر دولت ایک اچھے حساب دان کو چکر میں لانے کے لئے کافی تھی۔

میں نے یہ دولت کس طرح حاصل کی؟ کیا مجھے ورثہ میں ملی؟ میں نے جمع کی؟ لاٹری میں جیتی؟ جوئے میں حاصل کی؟ یا کسی طلسماتی جزیرہ سے سنگ پارس مل گیا جس سے میں نے تمام پتھر کا سونا بنا لیا؟ ان میں سے کوئی بات نہیں دراصل میں سب حال صحیح طور پر نہیں بتا سکتا۔ اور نہ مجھ کو صحیح کیفیت معلوم ہے مگر اس میں شبہ نہیں کہ یکایک اس قدر دولت میرے ہاتھ آگئی تھی۔ اس دولت سے میں کیا کرتا؟ اگر مجھے دو سو برس کی بھی عمر ملتی تو امید نہ تھی کہ میں اصل یا اس کا منافع صرف کر سکوں گا۔ میرا کوئی رشتہ دار بھی نہ تھا۔ پھر میں اس دولت کو کہاں خرچ کرتا؟ رہ رہ کر یہ خیال مجھے ستا رہا تھا کہ یکایک ایک بات ذہن میں آئی اور میں نے اپنے دوست مسٹر روشن لال کے ساتھ مشورہ کرنے کا ارادہ کیا۔

گھر سے نکل کر میں انار کلی میں آیا۔ گاڑی کرایہ کی اور مسٹر روشن لال کے مکان کے قریب پہنچ کر اتر گیا۔ گاڑی کا کرایہ صرف چند آنے تھا مگر میں نے گاڑی بان کو ایک اشرفی دے دی۔ گاڑی بان نے خیال کیا کہ میں نے غلطی کی۔ اس نے مطلع کیا۔ میں نے کہا "میرے دوست اس کو اپنے پاس رکھو۔ خدا کرے کہ اس سے تمہیں فائدہ پہنچے"

میں چلا گیا مگر گاڑی بان کی تشفی نہ ہوئی۔ اس نے وہ اشرفی ایک پولیس مین کو دکھائی اور انگلی سے میری طرف اشارہ کیا

"خدایا کیا دنیا ایسی ہے کہ مجھے میری فیاضی کے لئے پاگل خیال کرتی ہے۔ کیا دنیا میں اتنی بھی نیکی نہیں کہ ایک دوسرے کی امداد کی جا سکے الٰہی دنیا کا کیا حال ہو گیا ہے۔ یہ کیسی ذلت میں مبتلا ہے۔۔۔"

میں ان باتوں کو سوچتا ہوا مسٹر روشن لال کے دفتر میں پہنچا۔ اس وقت وہ کام میں مشغول تھے۔ ان کی میز پر مختلف کمپنیوں کے حساب کتاب کے کاغذات

پڑے تھے اور وہ ان میں اس قدر منہمک تھے کہ کچھ دیر تک انہیں علم نہ ہؤا کہ کوئی آدمی اندر آیا ہے تھوڑی دیر بعد انہوں نے اوپر نظر کی تو مجھے دیکھا اور فوراً اٹھ کر مصافحہ کیا۔ ہم دونوں بیٹھ گئے۔ میں نے تمام کیفیت ان سے بیان کی اور مشورہ کا طالب ہؤا۔

مسٹر روشن لال کچھ دیر خاموش رہے آخر تھوڑے وقفہ تک غور کرنے کے بعد انہوں نے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اس دولت کو کس جگہ لگا سکتے ہو۔ میری رائے میں تم اس روپیہ کو ساہوکارہ میں لگادو۔ عمدہ ضمانتوں پر روپیہ دینا شروع کرو۔ اس طرح سارے شہر کا سرمایہ خرید لوگے اگر یہ نہیں چاہتے تو اعلیٰ پیمانہ پر ایک دو کارخانے جاری کردو۔ تمہاری بڑی شہرت ہوگی اور ساری دنیا کی نگاہیں تمہاری طرف لگ جائیں گی اور یقیناً تم بڑے آدمی بن جاؤگے۔۔۔"

میں نے معلوم کرلیا کہ مسٹر روشن لال نے اپنے ہی مذاق کی صلاح مجھے دی ہے اور اس سے مجھے فائدہ بھی ضرور ہوگا۔ تاہم میں نے کہدیا کہ "میری مراد یہ نہیں کہ میری دولت اور زیادہ ہو بلکہ میں تو چاہتا ہوں۔ کہ اس سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچے۔ میں نے سوچا ہے کہ میں گورنمنٹ کو لکھوں اور یہ تمام روپیہ اسے دیدوں تاکہ اس سے تمام ملک میں جبری اور مفت تعلیم جاری کی جائے اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟"

مسٹر روشن لال حیرت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے "پاگل تو نہیں ہوگئے! یہ خیال کیونکر تمہارے دل میں سما گیا؟ اس سے بنی آدم کو سخت نقصان پہنچے گا کیا تم نہیں جانتے کہ اگر ہندوستان میں جبری تعلیم کا نفاذ ہوجائے تو اس سے کارخانہ داروں کو کس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا

مزدوروں کی قلت ہر طرف محسوس ہو رہی ہے۔ خدمت گار میسر نہیں آتے۔ صنعتیں اور کارخانے مزدوروں کے قحط کے باعث تباہ ہو رہے ہیں۔ ملک کی بے انتہا معدنی دولت بے کار پڑی ہے۔ فراوانی کے صدہا ذرائع مزدوروں کی کمی کا رونا رو رہے ہیں۔ دیکھتے نہیں کہ یورپین ملکوں میں کیا اندھیر ہو رہا ہے آئے دن ہڑتالیں ہوتی ہیں۔ شور و شر کا ایک طوفان منڈلاتا رہتا ہے۔ سرمایہ داروں کی قسمتیں مزدوروں کے ہاتھ میں ہو گئی ہیں۔ میں یہ ہرگز تسلیم کرنے کو آمادہ نہیں کہ اس شور و شر یا اس آمدنی کی زیادتی سے مزدوروں کی مالی اور تمدنی حالت بہتر ہوتی جاتی ہے ہرگز نہیں۔ اب وہ شراب زیادہ پیتے ہیں۔ تماشا گاہوں میں زیادہ جاتے ہیں۔ اور اپنی عورتوں کی مرمت زیادہ کرتے ہیں۔ کیا تم ہندوستان میں بھی یہی حالتیں پیدا کرنا چاہتے ہو؟ میں کہتا ہوں انسانی اخوت ایک مہمل اور انہونی بات ہے۔ یہ دیوانگی ہے، جنون ہے۔ اور نظام قدرت کو درہم برہم کرنے والا خیال ہے آپ لوگ خدا کی خدائی میں دخل دینا چاہتے ہیں۔ کیا خدا کے لئے غیر ممکن تھا کہ وہ ہر ایک انسان کے دماغی اور جسمانی اوصاف یکساں خلق کرتا؟ پھر یہ ناہمواریاں۔ یہ نابرابریاں کیوں نظر آتی ہیں؟ کیا آم کے جتنے درخت ہیں سب یکساں وسعت اور اونچائی کے ہیں؟ کیا قدرت کی کسی شے کے متعلق آپ ایسا کہہ سکتے ہیں؟ حق یہ ہے کہ یہی ناہمواریاں نظام قدرت کا شیرازہ ہیں خدا کے لئے اس خیال خام سے درگزرو۔ تم دنیا میں ہلچل مچا دوگے۔ اور دنیا کا کاروبار زیر و زبر ہو جائے گا۔ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ تم جوئے میں دولت ہار دو۔ تماشا گاہوں میں برباد کر دو کسی نہر کے کھدوانے میں صرف کر دو۔ اور اگر کچھ نہ بن سکے تو سمندر میں غرق کر دو۔ ...."

میں اٹھ کر چلا آیا۔ اس سے میری کچھ تسلی نہ ہوئی میں نے فوراً ایک چھٹی

گورنمنٹ کو اس مضمون کی لکھی۔ مگر تعجب ہے کہ وہاں سے صرف یہ جواب آیا کہ "تمہاری چٹھی پہنچ گئی ہے۔ اور فرصت کے وقت اس پر غور کیا جائے گا۔"

۲

ایک روز میں اخبار پڑھ رہا تھا۔ لوکل خبروں کے ضمن میں ایک ایسی خبر نظر آئی جس کو پڑھ کر میں چونک اٹھا۔ اس میں لکھا تھا۔ کہ ایک گاڑی بان نے اپنی بیوی پر حملہ کیا۔ ملزم ماخوذ ہو کر عدالت میں پیش ہوا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ گاڑی بان کو کسی مسافر نے ایک اشرفی دی تھی۔ اسی دن اس نے شراب پی اور بدمستی کی حالت میں اپنی بیوی کو مارا۔ ہمسایہ کے لوگ شہادت دیتے ہیں کہ اس سے پیشتر اس نے اپنی بیوی کو کبھی نہیں مارا تھا۔ صرف بدمستی کی حالت میں اس پر حملہ کیا۔

اخبار میرے ہاتھ سے گر پڑا۔ الٰہی میں نے تو وہ اشرفی اس لئے دی تھی۔ کہ غریب آدمی کے کام آئے گی۔ مگر اس سے الٹا نقصان پہنچا۔ کہ اس کی بیوی کی جان پر آبنی۔ اگر یہ دولت میرے کام کی نہیں تو کیا کسی اور کے کام بھی نہیں آسکتی؟ پھر لوگ کیوں دولت کے پیچھے پڑے رہتے ہیں جبکہ اس سے ایسے ایسے برے نتائج پیدا ہوتے ہیں"؟ میں سخت مضطرب ہو گیا اور بے اختیار ہو کر گھر سے نکل جانے کو جی چاہا۔

اسی اثنا میں میرا خدمت گار اندر آیا۔ اور خبر دی کہ کوئی اجنبی شخص ملاقات کے لئے آیا ہے۔ میں سمجھ گیا کوئی غرض مند ہو گا میں نے اسے اندر بلا لیا اس کے چہرہ پر ذلت و ادبار کے آثار نمایاں تھے۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے اور پیروں کی جوتیاں بھی شکستہ تھیں غرض اس کی حالت بہت ابتر تھی۔ میں اسے جانتا تھا۔ پہلے وہ ایک دفتر میں محرر تھا میں نے اس کے ساتھ مصافحہ

کیا اور کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔

وہ رکتے ہوئے کہنے لگا "معاف فرمایئے گا میں نے سنا ہے کہ آپ کو یک لخت کثیر دولت ہاتھ آئی ہے۔۔۔"

میں نے دل میں خیال کیا کہ دیکھو بری خبر کس قدر جلد پھیل جاتی ہے تاہم میں نے اس سے دریافت کیا "کہ کس نے تم سے کہا؟" اس نے جواب دیا "خبر دینے والے کا نام تو مجھے یاد نہیں مگر تمام شہر میں اس کا چرچا ہے۔"

کچھ دیر میں خاموش رہا۔ بعد ازاں میں نے دریافت کیا "بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

وہ بولا "میں مدت سے بے کار ہوں میری حالت بہت ابتر ہو گئی ہے کپڑے تک پھٹ گئے ہیں۔ اب مجھے ملازمت کے لیے کسی کے پاس جاتے ہوئے شرم آتی ہے میں صرف اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ اگر ممکن ہو تو پچاس ساٹھ روپے بطور قرض مجھے مرحمت فرمایئے۔ تاکہ میں اپنی حالت درست کر کے ملازمت تلاش کر سکوں۔"

میرے سامنے پچاس ساٹھ روپے کیا حقیقت رکھتے تھے مجھ سے ایسی قلیل رقم کا سوال کرنا گویا میری ہتک کرنا تھا۔ مگر مجھے اس بات کا اندازہ ہو گیا۔ کہ دنیا بہت کم فیاض ہے اور کسی کے ساتھ مروت نہیں کر سکتی۔ اس لئے مانگنے والے بھی رک رک کر سوال کرتے ہیں مگر دنیا بھی ایک پہلو سے سچی ہے۔ بعض وقت مانگنے والے گداگری پیشہ ہوتے ہیں جن کو دراصل امداد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کو کچھ دینا روپے کو ضائع کرنا ہے مگر میری رائے میں انسان کو فیاض ضرور ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس سلسلے میں ان لوگوں کی بھی امداد ہو جاتی ہے جو واقعی حاجت مند ہوتے ہیں۔

کچھ روز ہوئے میں نے ایک گاڑی بان کو اشرفی دی تھی۔ اس سے اس کی بیوی کو سخت نقصان پہنچا۔ اور وہ قریب المرگ تھی۔ شاید میری اس اشرفی نے اس لئے نقصان پہنچایا۔ کہ وہ ایک قلیل رقم تھی۔ اور شراب نوشی کے سوا کوئی اور بہتر کام اس سے نہ لیا جا سکتا تھا۔ اب میں دوسرا تجربہ کرتا ہوں اس دفعہ غریب محرر کو اتنا روپیہ دیتا ہوں کہ آئندہ اسے کسی قسم کی ضرورت نہ ہوگی اور وہ دولت کا حقیقی فائدہ حاصل کر سکے گا اگر روپیہ کی مقدار زیادہ ہوگی۔ تو شاید وہ اسے بُرے کاموں میں صرف نہ کر سکے گا۔

میں نے جیب سے ایک نوٹ نکال کر دیا اور کہا "محب من یہ چھوٹی سی رقم بطور امداد تمہاری نذر کرتا ہوں اس کو قرض مت سمجھو۔ اور اس سے اپنی حالت درست کر لو"

پرشوتم نوٹ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا اس نے مجھ سے دریافت کیا "جناب آپ سے غلطی تو نہیں ہوئی؟"

میں نے جواب دیا "نہیں میں نے پانچ ہزار کا نوٹ تمہیں اس لئے دیا ہے۔ کہ تم اسے کسی عمدہ کام میں لگاؤ۔ اور اس کے منافع سے اپنی حالت درست کر سکو"

اس نے جواب دیا "آپ مطمئن رہیں میں اس کو صحیح طریقہ پر ہی استعمال کروں گا"

اس کے بعد اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور چلا گیا۔

اب میرا دل کسی قدر ٹھنڈا ہوا۔ خیال آیا کم از کم ایک آدمی کے ساتھ تو میں نے نیکی کی۔ اس سے ضرور اس کو فائدہ پہنچے گا۔ اس کے بعد میں گاڑی بان کے گھر پہنچا۔ مگر افسوس اس کی بیوی مر چکی تھی۔ مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا

کہ اس کے کفن دفن کے اخراجات ادا کرتا۔ افسوس وہ بے چاری میری اشرفی کا شکار ہو گئی۔

دل میں کڑھتا ہوا میں اپنے مکان پر واپس آگیا۔

۳

اخبار پاینیر نے خبر شائع کی تھی کہ "فلاں شخص اس قدر روپیہ گورمنٹ کو دینا چاہتا ہے تاکہ اس سے ملک میں ابتدائی تعلیم جبری اور لازمی قرار دی جائے۔ مگر گورمنٹ نے بوجوہ چند در چند بالفعل اس روپیہ کو لینا منظور نہیں کیا"

اس غیر ضروری خبر کی اشاعت نے میرے وقت کو بہت خراب کیا۔ عام طور پر اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ میں اپنی کثیر دولت کو تعلیم عامہ کی حد میں صرف کرنا چاہتا ہوں واقعی میرا مقصد یہی تھا مگر سمجھنے والے میرے مفہوم کو نہ سمجھ سکے۔

ایک روز میں ڈاک دیکھ رہا تھا کہ ایک خط کا مضمون پڑھ کر بہت حیران ہوا۔ معاً خیال آیا۔ کہ "دیکھو دولت میں کتنی کشش ہے میں وہی آدمی ہوں جس کو ایک ماہ پیشتر محلہ والے بھی نہ جانتے تھے یا اب یہ حالت ہے کہ دور دور میرا نام پہنچ گیا اور لوگ مجھ سے ملاقات کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ واقعی یہ سب دولت کے کرشمے ہیں"

باقی ڈاک دیکھی اس میں ایک اور خط ملا۔ اس کا مضمون بھی اس قسم کا تھا۔ جو پہلے خط کا تھا۔ اب میری حیرانی کی کوئی حد نہ تھی۔ میں بے حسی کی سی حالت میں ٹھنڈے دل سے ان خطوں پر غور کرنے لگا۔

شام کو ہوا خوری کے لئے باہر گیا تو میرے دوست بابو جسونت رائے

راستے میں مل گئے۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں آخر میں نے ان سے مشورہ
طلب کیا میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا۔ کہ بڑے بڑے نواب۔ راجہ مہاراجہ
اور مولوی پنڈت فرقہ وارانہ ہاسٹل یونیورسٹی کی تحریک کے سلسلہ میں میرے پاس
آنے والے ہیں آج ہی مجھ کو ان کے خط ملے ہیں اب آپ کیا صلاح دیتے ہیں؟

بابو جسونت رائے نے جواب دیا یہ دونوں تحریکیں بجائے خود مفید
ملک ہیں مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ ان سے جس قدر فائدہ کی امید کی جاتی ہے۔
اس کا چوتھائی حصہ بھی بمشکل حاصل ہوگا۔ فی الواقعہ یہ تعلیم کو گراں اور محدود
بنانے کا سہل اور فریب دہ لٹکا ہے کیا ایک وسیع بورڈنگ ہوس میں
شب و روز کی بود و باش معجزے کر دکھائے گی؟ مانا کہ بہت سے طلبا ایک
ایک ساتھ رہیں گے۔ تو ان میں اتفاق و اتحاد بڑھے گا۔ وہ اپنے گھروں
کے مضر اور مخرب اخلاق اثرات سے محفوظ رہیں گے ان میں اخوت اور
ہمدردی کے جذبات پیدا ہوں گے۔ مگر کیا یہ اغراض عام بورڈنگ ہوسوں
سے حاصل نہیں ہو سکتے؟ اس کی تخصیص کیوں کی جاتی ہے کہ یہ سکونتی
یونیورسٹی ہو۔ پر تکلف بورڈنگ ہوس بنوائیے۔ اسے امیرانہ سازو
سامان سے آراستہ کیجئے۔ اور ہر ایک بورڈنگ ہوس کے لئے جدا جدا ڈاکٹر
سپرنٹنڈنٹ اور معلم مقرر کیجئے۔ اس سے کون روکتا ہے مگر خدا کے لئے
یونیورسٹی کا دروازہ غربا پر بند نہ کرو۔ آکسفورڈ کی تقلید میں کیوں اپنے
ہوش و حواس کھو رہے ہو؟ آکسفورڈ اور کیمبرج روسا اور امرا کی
تفریح گاہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ انہیں تعلیمی تکلفات کہہ لیجئے۔ انگلستان
مالدار ہے اور اس کے لئے یہ فضول خرچیاں زیبا ضروری ہیں مگر ہندوستان
مفلسوں کا ملک ہے یہاں ان تکلفات کی ضرورت نہیں میرے صدہا

ایسے دوست ہیں جو اپنے نوجوان لڑکوں کو بورڈنگ ہوس میں کسی طرح
رہنے نہ دیں گے سکونتی انتظام میں جہاں خوبیاں ہیں وہاں نقائص بھی
ہیں۔ اگر لڑکے گھر کے مضر اثرات سے بچے رہتے ہیں تو نیک اثرات
سے بھی محروم رہتے ہیں۔ اگر اتفاق و اتحاد بڑھتا ہے تو مزاج
میں تکلف نخوت اور عیش پسندی کا دخل بھی ہو جاتا ہے۔ اور اخلاق؟
خدا کی پناہ! میں اور تم دونوں بورڈنگ ہوس میں رہ چکے ہیں اور اس
کے زہریلے اثر کا آج تک رونا روتے ہیں میں اپنے لڑکوں کو اس
زہریلی فضا میں ہرگز نہ پھینکوں گا اور غالباً آپ بھی مجھ سے اتفاق کریں
گے۔ رہ گئی تعلیم تو بندہ نواز جب تک یہی بھاڑے کے ٹٹو پروفیسر
رہیں گے اس وقت تک تعلیم کی حالت ذرہ بھر بہتر نہ ہو گی سب سے
بڑی ضرورت لائق پروفیسروں کی ہے۔ اور انہیں کا آجکل قحط ہے
ملک کے سب سے بڑے سنسکرت کالج ہی کو دیکھئے۔ وہ کوئی رہائشی
کالج نہیں۔ لیکن چونکہ لائق ترین سنسکرت علما نے اسے اپنا مرکز بنالیا
ہے۔ اس لئے دور دراز سے طلبا کھنچے چلے آتے ہیں مدراس سندھ
اور آسام غرض سب خطوں کے طلبا وہاں موجود ہیں اگر تمہاری
جگہ پر میں ہوتا تو سکونتی یونیورسٹی کے نام پر کانی کوڑی بھی نہ دیتا۔ یہ
غضب ہے زیادتی ہے ظلم ہے ان لوگوں پر جو تعلیم کے نام سے
بے بہرہ ہیں اور اگر میرے دل کی بات پوچھئے تو یہ ہے کہ دو نرالی یونیورسٹیوں
کی بنیاد فرقہ بندی اور رقابت پر ہے لیڈران قوم زبان سے خواہ کچھ ہی
کیوں نہ کہیں مگر واقعہ نفس الامری یہی ہے ورنہ کیا سبب ہے کہ جب
کوئی ہندو رئیس کسی یونیورسٹی کے لئے کوئی شاہانہ رقم دے ڈالتا ہے

تو اسلامی حلقوں میں کہرام سا مچ جاتا ہے۔ اور چہرے زرد پڑ جاتے ہیں۔ بعینہٖ یہی کیفیت ہندو صاحبان کی اسلامی چندوں پر ہوتی ہے یہ حسد اور رقابت نہیں تو اور کیا ہے وہ تعلیم گاہ جس کی بنیاد ایسی کمزور ہو کبھی عرصہ تک سرسبز نہیں رہ سکتی۔ نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ دونوں یونیورسٹیاں تعلیمی اغراض و مقاصد کو نظر انداز کر کے پولیٹیکل مناقشات میں اپنی کوشش صرف کرنے لگیں گی۔ اور وہاں سے جو گریجوایٹ نکلیں گے وہ فرقہ بندی اور منافرت کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں گے۔ میں اسے اس بدنصیب اور پامال ملک کی شومی قسمت سمجھتا ہوں۔ آپ یہ ہرگز خیال نہ کریں کہ مجھے ان یونیورسٹیوں کے بانیوں سے ذاتی خصومت ہے مگر آپ انہیں ایسا صاف باطن اور فرشتہ اخلاق بھی نہ سمجھئے۔ جتنا وہ بنتے ہیں۔ میں ان میں سے ایک صاحب کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ زندگی بھر قومی خدمت میں مصروف رہے یعنی گارڈن پارٹیوں اور سرکاری جلسوں میں مدعو ہوا کئے۔ مگر باوجود اسکے کہ گھر میں لاکھوں کی دولت تھی حبہ کسی قومی کام کے لئے نہ دیا۔ مرے تو لاکھ چھوڑ گئے مگر وصیت میں قومی کالجوں، مدرسوں اور لیگوں کا مطلق ذکر نہ تھا سب کو حیرت ہوئی لیکن مجھے مطلق تعجب نہ ہوا۔ کیونکہ میں ان کی طینت سے واقف تھا خالی پیٹ کا ڈھول کس زور سے گرجتا ہے۔ لوگ انہیں قوم کا فدائی اور دیوانہ سمجھتے تھے لیکن حضرت رنگے سیار نکلے۔

"ذرا آپ ان حضرات کی وحشت دیکھئے بنانے تو چلے دارالعلوم مگر چارٹر پہلی شرط ہے اور یقین مانئے یہ چارٹر ان تمام اغراض کے لئے نوشتہ مرگ ہے جو اس یونیورسٹی کے محرک ہوتے ہیں میں دریافت کرتا ہوں اس چارٹر کی ضرورت

کیا ہے؟ یہی نا کہ ان یونیورسٹیوں کے پاس شدہ طلبا سرکاری ملازمتیں حاصل کر سکیں
چند سرکاری ملازمتوں کے لئے آپ ایسے کثیر مصارف کو، ایسی سرتوڑ کوششوں
کو، یونیورسٹی کے وجود کو، حتیٰ کہ اس کی آزادی کو خاک میں ملا رہے ہیں اسی کو قومی خود
کشی کہتے ہیں۔ کیا موجودہ کالج خواہش مندان ملازمت کے لئے کافی نہیں ہیں؟ کیا
سرکاری ملازمت ہی سب سے اہم اور اعلیٰ قومی مقصد ہے؟ ہمارے ہزاروں
نوجوان امریکہ یورپ اور جاپان کو حصول تعلیم کے لئے جا رہے ہیں وہ روانگی کے وقت
گورنمنٹ سے یہ سوال نہیں کرتے۔ کہ آپ انسائیس۔ ٹیل۔ برلن۔ پیرس اور ٹوکیو
یونیورسٹی کے طلبا کو ملازمت دیں گے یا نہیں؟ یہاں یہ سوال کیوں پیدا ہوتا ہے؟
کیا ہمارے لیڈر ایسے سادہ لوح ہیں۔ کہ وہ اتنا نہیں سمجھتے کہ لیاقت اور کارگزاری
جہاں کہیں دستیاب ہوگی اس کی قدر کی جائے گی۔ اور اگر ارزاں ہوگی تو اور بھی
کشادہ دلی ہے اس لئے پہلے ہی سے عہد و پیمان کی کیا ضرورت ہے؟ اس سے تو یہ
اندیشہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ آپ کو خود اپنی کامیابی پر شک ہے الغرض اور المختصر میں
ان تحریکوں کو فضول اور مضر سمجھتا ہوں"

میں نے اس رائے پر صاد کیا اور دل میں سوچنے لگا کہ یونیورسٹی کی تعلیم کن لوگوں
کے لئے ہے۔ انہیں لوگوں کے لئے نا جو پیسے والے ہیں؟ پھر کیا ضرورت ہے کہ پیسے
والوں کی امداد کے لئے ہم اپنا بھی پیسہ خرچ کریں۔ ہاں ضرورت اس بات کی ہے
کہ جن لوگوں کے پاس پیسہ نہیں ان کی تعلیم کا سامان مہیا کیا جائے۔ غریب لوگوں
کے بچے پرائمری تعلیم بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ مگر ان کی حالت پر ہمارا دل نہیں
پسیجتا اگر کچھ کوشش کرتے ہیں تو انہیں لوگوں کے لئے جو اپنے لئے خود اچھا انتظام
کر سکتے ہیں۔۔۔ جب تک ملک میں ابتدائی تعلیم عام نہ ہوگی۔ اس وقت تک
ایسی یونیورسٹیاں بے کار ہیں!

بابو جسونت رائے سے وداع ہو کر میں اپنے گھر چلا آیا۔ اور انہیں معاملات پر غور کرتا رہا۔ مگر کوئی ایسا پہلو نظر نہ آیا۔ جس کی بنا پر میں بھی ان تحریکوں میں حصہ لے سکتا

دوسرے روز یونیورسٹیوں کے فدائی علیحدہ علیحدہ وقت میں میرے در دولت (؟) پر حاضر ہوئے۔ مگر میں نے پیسہ دینے کے بجائے "ٹکا" سا جواب دیا۔ اگرچہ اس بات کا مجھے بھی افسوس رہا۔ کہ کیوں میں نے ایسا سلوک ان سے کیا

۴

شام کو ایک مسیحی صاحب تشریف لائے۔ میں انہیں عرصہ سے جانتا ہوں آپ صوبجات متحدہ راجپوتانہ کی انڈین کرسچن ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری ہیں۔ اچھے خوش خلق اور ملنسار آدمی ہیں انہوں نے کوشش کر کے گورنمنٹ سے کچھ زمین حاصل کی ہے اور وہاں ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک اکیڈمی قائم کیا چاہتے ہیں جس میں ہندوستانی مسیحی لڑکوں کو اعلےٰ تعلیم دی جائے گی۔ گورنمنٹ نے بھی امداد کا وعدہ کیا ہے انہوں نے مجھ سے بیان کیا کہ مطلوبہ رقم کا قریباً نصف حصہ جمع ہو چکا ہے اگر باقی رقم آپ دے دیں تو اکیڈمی جلد تیار ہو جائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ شکریہ کے طور پر آپ کے نام پر ایک ہال تعمیر کر دیا جائے گا۔ مگر میں ایسے نام و نمود کا خواہاں نہ تھا۔ میں نے کہا آپ یونہی تکلیف فرماتے ہیں۔ میں ان باتوں کا قائل نہیں ہوں مانا کہ آپ نے بذاتہ اکیڈمی کے لئے کوئی اچھا اصول قائم ہو۔ مگر میری نظر میں اس کی وہ عزت نہیں ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ اکیڈمی قومیت شکن لوگوں کا ایک بڑا گروہ پیدا کرنے کا ذریعہ ثابت ہوگی۔ ایسے لوگوں کی تعداد آج کل ہی کیا کم ہے۔ جو ان کی تعداد بڑھانے کی فکر آپ کو دامنگیر ہوئی ہے دیسی مسیحیوں کو اس سے خاک فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ البتہ وہ لوگ نفع میں رہیں گے جن کے اعزاء اقارب اکیڈمی کی مینجنگ کمیٹی کے ممبر ہوں گے۔"

میری اس صاف گوئی سے وہ کسی قدر رنجیدہ خاطر ہو گئے۔ انہوں نے کہا۔

"آپ مفت الزام لگاتے ہیں ۔ ایسی کارروائی ہرگز نہ ہوگی ۔ جملہ امور اتفاق رائے سے قائم ہوا کریں گے ۔ اکیڈمی کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ قوم کو اٹھایا جائے تاکہ وہ منازل ترقی طے کر سکے"

غصہ میری طبیعت میں بہت ہے اور میں کسی ایسی بات کو گوارا نہیں کر سکتا جو میرے روبرو کہی جائے ۔ میں نے صاف کہدیا ۔ کہ "جناب مجھ کو معاف کیجئے ۔ ایسوسی ایشن کی طرف سے جو وظائف غریب مسیحی طلباء کے لئے مقرر ہیں بتایئے ۔ کتنے غریب مسیحیوں کو ان سے فائدہ پہنچا ہے ؟ جس قدر وظائف دیئے جاتے ہیں ۔ وہ زیادہ تر ایسوسی ایشن کی جنرل کمیٹی کے ممبروں ہی کے لواحقین کو ملتے ہیں ۔ اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو امداد کی مطلق ضرورت نہیں ۔ عام لوگوں کے پیسے سے لکھ پڑھ کر ان میں اس قدر انانیت سما جاتی ہے کہ مصافحہ کرنا تو درکنار غریب مسیحیوں کا سلام بھی قبول نہیں کرتے ۔ کیا اکیڈمی کا بھی یہی نتیجہ نہ ہوگا کہ اس قسم کا ایک خود سر گروہ پیدا کرے جو اپنے آپ کو ہندوستانی کہلانا پسند نہ کرے ۔ اور جو ہندوستانی والدین کی اولاد ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اینگلو انڈین کہہ کر ہندوستانی مسیحیوں پر اپنی بزرگی ثابت کرے ۔ . . . بہرحال ایسے قومیت شکن لوگوں کے لئے میں اپنا روپیہ ضائع کرنا نہیں چاہتا"

آخر وہ رخصت ہو گئے ان کے جانے کے بعد بہت دیر تک میں اکیڈمی کے معاملات پر غور کرتا رہا ۔ اور میں اپنے دل میں بہت خوش تھا ۔ کہ میں نے ایسی فضول تحریک میں حصہ نہ لیا

۵

دونوں یہ دن گذرتے جا رہے تھے ۔ پر میں اب تک کچھ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ آخر کیونکر اس دولت کو صرف کروں ۔ جب اخبارات میں میری دولت کا تذکرہ ہوا تو میرے بہت سے دوست نکل آئے ۔ دوست بھی ایسے کہ مجھ پر جان فدا

کہنے کو تیار تھے۔ مگر میں ان کو بھولا نہ تھا۔ یہ وہی حضرات تھے جنہوں نے مصیبت کے وقت مجھ کو پیٹھ دکھائی تھی۔ کوئی باپ کی وفات کی وجہ سے گوشہ نشین ہوگیا تھا۔ کسی نے شادی کرلی تھی۔ اور گھر بار کے دھندوں میں پھنس گیا تھا کسی کے سر پر دفتر کا اس قدر کام آپڑا تھا۔ کہ ۲۴ گھنٹے میں پندرہ منٹ کی بھی فرصت نہ ہوتی تھی۔ غرض سب نے ایک سے ایک نیا بہانہ بنا کر مجھ سے روپوشی اختیار کرلی تھی یا اب سب ایک دم گویا بے کار ہوگئے تھے۔ کہ دن رات میرے دروازہ سے ٹلنے کا نام نہ لیتے تھے۔ بات یہ تھی کہ وہ پہلے بھی روپے کی وجہ سے ملتے تھے۔ اور اب ملتے ہیں تو وہ بھی روپے کی وجہ سے۔ جب روپیہ نہ تھا۔ تو تو کون اور میں کون۔ گویا یہ میرے نہیں بلکہ میری دولت کے یار تھے۔

اگر میں اپنے ان وفادار (؟) دوستوں کی رائے پر عمل کرتا تو اس میں کچھ شک نہیں کہ بہت جلد اس سے چھٹکارا پاجاتا۔ مگر میں کچھ ایسا کوتاہ فہم نکلا۔ کہ ان کی ایک بات پر بھی عمل نہ کرسکا۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ تعلیم عامہ کے خیال کا جن میرے سر پر سوار ہوگیا ہے۔ شاید ایسا ہو میں اس کی بابت کچھ نہیں کہہ سکتا۔

پرنس رنبیر سنگھ کے اسراف نے اسے بہت شہرت دیدی تھی۔ جابجا اس کی تکلیفوں کے چرچے تھے۔ جدھر نکلتا تھا۔ ادھر ہی انگشت نمائی ہوتی تھی مجھے اس کی حالت پر بہت ترس آیا۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ ایک ہندوستانی شہزادہ اپنی بے سمجھی کے باعث ادبار میں پھنس گیا ہے اگر اس کو ایک موقعہ دیا جائے تو شاید آئندہ وہ ہندوستان کی ناک رکھنے کی کوشش کریگا۔ دو چار کروڑ روپیہ کوئی بات نہ تھی۔ میں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ آئندہ ولایتی ڈاک سے اس قدر روپیہ ضرور اسے ارسال کردونگا۔ کہ وہ اپنی عزت قائم رکھنے کے قابل ہوسکے۔ مگر جب میرے دوست سردار کشمیرا سنگھ کو میرے ارادہ کی اطلاع ہوئی تو فوراً تشریف

لائے اور آتے ہی مجھے سخت سست کہنے لگے۔ ان کی بھی یہ رائے تھی کہ زیادہ روپے نے میرا سر پھیر دیا ہے۔ انہوں نے کہا۔ کہ ہندوستانی رئوسا آگے ہی عیش و عشرت میں مگن رہتے ہیں۔ کوئی ملکی یا قومی کام ان سے ہو نہیں سکتا۔ جب سنئیے گا یہی سنئیے گا کہ فلاں ریاست کورٹ آف وارڈس میں چلی گئی۔ تاہم ان لوگوں کو تو پھر بھی ایک سہارا ہوتا ہے۔ کہ اپنی ریاست ہے مگر پرنس رنبیر سنگھ کی تو کوئی ریاست نہیں۔ اور اس پر بھی اگر وہ سوچ سمجھ کر خرچ نہ کرے تو اس میں کسی کا کیا قصور ہے؟ اگر آپ اسے کچھ امداد دیں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ ہندوستانی رئوسا کی عیش پسندی کی تحریک ہوگی

خدا کے لئے آپ ایسی نادانی نہ کر بیٹھئے ورنہ سن لیجئے گا کہ ہندوستان ہی میں کتنی ریاستیں بگڑ گئی ہیں۔ پھر آپ کس کس کو سنبھالئے گا؟

یہ صلاح اس قابل تھی۔ کہ بلا چوں وچرا اس کو مان لیا جاتا چنانچہ میں نے یہی کیا اور اس ارادہ کو فسخ کر دیا۔

۶

انڈریو کارینگی نے ایک مرتبہ اشتہار شائع کیا تھا۔ کہ کوئی تبائے وہ کیونکر اپنی دولت کو صرف کرے۔ کارینگی کی دولت میری دولت کے آگے بے حقیقت چیز تھی اور اس پر بھی وہ خود اس کو صرف نہ کر سکتا تھا میں نے خیال کیا چلو میں بھی اخبار میں اشتہار دے کر دیکھ لوں۔ شاید کوئی مفید مطلب مشورہ مل جائے مگر پھر سوچ آئی کہ یہ تقلید کہلائے گی کچھ جدت ہونی چاہیئے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً اخبارات میں ایک اشتہار چھپوا دیا کہ

(۱) متوسط درجے کے لوگ قرض میں مبتلا ہیں اگر وہ اس بات کا اقرار کریں کہ آئندہ قرض سے نفرت کریں گے تو فلاں تاریخ کو فلاں وقت میرے پاس آئیں

میں ان کا قرض چکا دوں گا

(۲) جو لوگ کسی ملکی یا قومی خدمت میں مصروف رہتے ہیں اور ان کو اپنے مشن کے لئے امداد کی ضرورت ہے وہ بھی اسی روز مجھ سے ملاقات کریں۔

اشتہار چھپ گیا دُور دُور تک اس کی شہرت ہو گئی۔ ریل والے بھی حیران ہو گئے۔ ان بے چاروں پر بہت سا زائد کام آ پڑا تھا۔ جو شخص سوار ہوتا خواہ وہ کسی سٹیشن سے سوار ہوتا لاہور تک کا ٹکٹ لیتا تھا۔ اسٹیشنوں پر چھپے ہوئے ٹکٹوں کے علاوہ سادہ ٹکٹ بھی ختم ہو گئے تھے۔

ابھی چار پانچ دن باقی تھے۔ میں اپنے دل میں بہت خوش تھا۔ کہ اب جلد اس دولت سے چھٹکارا پا لوں گا۔ دوپہر کے وقت میں ایک پرانا اخبار دیکھ رہا تھا ایک نئی کمپنی کا اشتہار میری نظر سے گذرا جس کا سرمایہ ساڑھے سات لاکھ تھا اور تعجب یہ کہ نصف حصے پرشوتم نے خرید کئے تھے۔ میں حیران ہوا دل میں رہ رہ کر یہی سوال اٹھتا تھا کیا یہ وہی پرشوتم نہیں ہے؟ پھر اس قدر دولت اس کے پاس کہاں سے آ گئی ہے؟ مگر بعد ازاں سب راز کھل گیا۔ یہ نئی کمپنی بہت جلد تباہ ہو گئی جس روز میں نے اشتہار دیکھا تھا۔ اس کے دوسرے ہی دن پرشوتم دغا کے جرم میں گرفتار ہو کر عدالت میں پیش تھا۔ اس نے میرے پانچ ہزار سے نہایت نکما کام شروع کیا تھا۔ اور پھر اسے بیس ہزار میں ایک جعل سے فروخت کر دیا۔ دس۔ ہا غریبوں اور یتیموں کا روپیہ برباد کیا میں بڑے غور کے ساتھ مقدمہ کی کارروائی دیکھتا رہا۔ مجھے بے حد ملال تھا۔ کہ میری دولت سے اس قدر لوگوں کو نقصان پہنچا۔ مگر میرے پاس کافی دولت تھی میں نے سوچا روپیہ کی تلافی آسانی سے ہو سکتی ہے۔ میں نے فوراً ایک اور اشتہار دے دیا۔ کہ جن لوگوں نے پرشوتم کے ہاتھ سے نقصان اٹھایا ہے وہ بھی فلاں تاریخ کو آ کر مجھ سے روپیہ

لے جائیں۔

۷

سنیچر کی صبح کو میں نہایت خوش خوش بستر سے اٹھا۔ ملازم نے خبر دی کہ ہزاروں آدمی احاطہ میں جمع ہیں۔ میں نے جا کر دیکھا تو واقعی اس قدر بھیڑ نظر آئی کہ ماگھ میلہ کا گمان ہوتا تھا۔ سرسری نظر ڈالنے سے ان میں بہت سے آدمیوں کو میں نے پہچانا۔ ان میں سے بعض ایسے لوگ بھی نظر آئے۔ جو قومی اور مذہبی خدمت کے بہانہ سے خوب روپیہ اینٹھتے ہیں کوئی یتیم خانہ کے شاہ ہیں۔ کوئی ہندوستان میں الالزہر کی نظیر قائم کیا چاہتے ہیں کوئی کئی کئی موسوم امیدوں کے سبز باغ دکھا کر گلچھرے اڑاتے ہیں۔ کوئی کچھ کوئی کچھ اور۔ مگر مجھے ان باتوں سے کچھ سروکار نہ تھا میں نے ہاتھ منہ بھی نہ دھویا۔ اپنا کیش بکس لے کر بیٹھ گیا۔ اور چاروں طرف چک لکھ لکھ کر پھینکنے لگا۔ جس نے جس قدر اپنی ضرورت بیان کی یا جتنا پرشوتم کی طرف تجایا میں اسے بلا تحقیقات، چک لکھ کر دیتا گیا۔ میں نے بہت سارا روپیہ تقسیم کیا مگر ابھی صدہا لوگ کھڑے تھے۔ کہ اس اثنا میں دو مضبوط آدمی آئے انہوں نے مجھے پکڑ کر میری مشکیں کس لیں۔ میں نے انہیں منہ مانگا روپیہ دینے کا وعدہ کیا مگر انہوں نے روپیہ لینے سے انکار کیا اور کہا کہ "ہم تو صرف آپ کو چاہتے ہیں۔ اب آپ ہمارے ساتھ چلئے۔ اور کچھ روز پاگل خانہ کی سیر کیجئے" میں زور زور سے چلانے لگا۔ جس سے آنکھ کھل گئی اور معلوم ہوا۔ کہ یہ سب خواب تھا!

میں نے بجائے ارب پتی ہونے کے وہی معمولی درجہ کا آدمی تھا جیسا کہ سونے کے وقت تھا۔ میں دل میں خوش تھا کیونکہ جو دولت اس قدر برے نتائج رکھتی ہو۔ اس سے دور رہنا ہی بہتر ہے مگر ہاں اس بات

کا اب تک افسوس ہے کہ ایسے اعلےٰ اعلےٰ نفوس کا دیدار مجھے خواب میں نصیب ہؤا۔ مگر میں ان کی کچھ بھی خدمت نہ کر سکا

(ش۔ پ ح) ——— (ادیب)

مرگِ محبوب

۱

جب دن کی روشنی آہستہ آہستہ نظروں سے غائب ہو گئی اور تارے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورنے لگے تو اس وقت میں نے دیکھا۔ کہ میری پیاری سو رہی تھی کمزور سانس اس کے کھلے ہوئے لبوں سے تھکراتی ہوئی آ اور جا رہی تھی پلکیں اس کی برف کی سی چتونوں پر سائے کی طرح پڑی ہوئی تھیں اور نیلی دھاریاں اس کی صاف و شفاف جلد میں نمایاں ہو رہی تھیں جب میں نے اپنی دلربا کو اس حالت میں دیکھا تو مجھ کو خوف . . . نہیں نہیں سخت خطرہ کا احساس ہوا۔ اور ایک فرشتے کی تصویر کا فوراً خیال آ گیا۔ جس کی صورت کا نقشہ میں نے ایک قبر پر بنا ہوا دیکھا تھا . . . ہاتھ باندھے، پر گرائے، مجسم انتظار کا فوٹو . .

اب ایسا معلوم ہونے لگا کہ اژدرِ غضب، اپنی آتشیں زبانیں نکالے ہوئے میرے دلِ مضطر پر ہر چہار طرف سے حملے کر رہے ہیں جو مجھے دیوانہ اور پریشان کر دینے کو کافی ہیں میں کہاں سے قوت پاؤں گا؟ کہاں سے ہمت لاؤں گا؟ آرام کہاں حاصل ہو سکا؟ ارے کم سے کم امن ہی کیونکر نصیب ہو گا؟ اف کیا اب اس پھیلی ہوئی زمین پر پہاڑ سی زندگی بے یار و غمگسار کاٹنی پڑے گی؟ کیا آرام و چین کہیں بھی میسر نہ ہو گا؟

"کہیں نہیں، کہیں نہیں!" روزنِ دیوار کی باد صرصر نے جواب دیا
مرجھائی ہوئی پنکھڑیوں کے زمین پر خوبصورتی کے ساتھ گرنے میں بھی
یہی آواز پیدا تھی۔ کہ "کہیں نہیں! کہیں نہیں"
چمکتے ہوئے تارے جو میری جلتی ہوئی آنکھوں سے برابر ہوئے تو
وہ بھی یہی پکار اٹھے "کہیں نہیں، کہیں نہیں"
کیونکہ یہ کل مصیبتیں ان کے نزدیک ایک پرانی کہانی اور روز روز کا قصہ ہے
دنیا دکھے ہوئے دلوں اور جگر خراش صدموں سے بھری ہوئی ہے انسانی ترقی
ایک دیرپا محنت ہے۔ ایک آواز ہے۔ جس کا کسی طرف سے جواب نہیں آتا۔
... ایک دعا ہے کہ جس کے لئے زمین سخت اور آسمان دور ہے،
میری پیاری چونک پڑتی ہے اور ایک سرد آہ بھی اس کے منہ سے نکل
جاتی ہے گری ہوئی پلکیں اٹھتی ہیں اور اس کی بیمار آنکھیں میری نظر سے دوچار
ہو جاتی ہیں،
"پیارے تم نہیں ہو! تمہارے پہلو میں بیدار ہونا کیسا فرحت افزا ہے"
"میری پیاری! میری دلربا! خدا کے لئے اس فرحت کو ہاتھ سے نہ جانے
دو۔ اس کو ترک نہ کرو! تمہارے بغیر میں تنہا کیا کروں گا؟ میں بھی کاش تمہارے
ساتھ ہی اس دنیا کو خیرباد کہتا!"
"نہیں پیارے نہیں! کیا تم بھول گئے کہ تم پر ابھی بہت سے فرض اور
بہت سے حقوق باقی ہیں؟ دنیا کہتی ہے کہ تم اعلےٰ جوہر! اعلےٰ قابلیت رکھتے
ہو۔ تم کو ہرگز نہیں چاہیئے۔ کہ اس کو کاہلانہ غم اور ماتم دشیوں میں برباد کرو
میں تم پر ہمیشہ ناز کرتی رہی اور غالباً دوسرے عالم میں بھی تمہاری ترقیوں کو
دیکھتی اور تمہاری کامیابیوں پر خوش ہوتی رہوں گی"

"پیاری یہ میری ساری قابلیتیں کل بلند پروازیاں اور سرورش غیب تمہارے ساتھ ایک ایک کر کے چل بسے مجھے اپنی سرد سنسان زندگی میں کونسی قوت حاصل کرنا۔۔ کونسی طاقت پیدا کرنا اور کونسی کامیابی ہوگی جس پر خوش ہونا باقی رہیگا"

"میرے دل کے مالک، شروع شروع میں تو نہیں، مگر جیسے جیسے وقت کچھ گزرتا جائے گا، طبیعت سنبھلتی جائے گی اور پہلی حالت پھر قائم ہونے لگے گی"

"پیاری یہ ہرگز نہیں ہو سکتا جب تک کہ زندگی سے زیادہ موت مہربان نہ ہو جائے"

اس نے زور سے آہ کھینچی اور دل کو سنبھال کر کہا "بے شک سخت افسوس ناک اور جگر خراش حالت ہے مگر پیارے اعلےٰ جوہر اور اعلےٰ قابلیت بہت بڑی تسلی دینے والی چیز ہے۔ اس کی وجہ سے تم زندہ رہو گے اور محنت کرو گے"

میرا دل دکھنے لگا اور ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکل سکا

اس وقت مجھ کو ایسا ہی معلوم ہوا کہ لفظ "تسلی" میرے کانوں کو ایسا ناگوار ہے جیسی کوئی بے سری تان۔ وہ اس وقت ایک بے معنی، کریہہ اور بے آہنگ لفظ سے بڑھ کر کچھ حقیقت نہ رکھتا تھا۔ تاریکی نے مجھ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ میرا دل گہرے اور تلخ پانی میں ڈوب گیا اور میں نے اس کا ڈوب ہی جانا پسند کیا اور مدد کے لئے ہاتھ یا آواز بلند نہ کی

۲

لاعلاج جدائی کی تاریکی آہستہ آہستہ ہم دونوں کو اپنے حلقے میں لا رہی تھی اور رفتہ رفتہ بغیر کسی تکلیف کے میری دلربا کی زندگی موسم بہار کی شفق کی طرح جو ہماری نظروں میں بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے مٹتی گئی۔ لیکن ایک روز

وہ ایسی اچھی اور ایسی بھلی معلوم ہونے لگی کہ میں پھر ایک مرتبہ حیات ساز امید کے فریب میں آکر اترانے لگا۔

وہ اپنے چاروں طرف تکیوں کا ڈھیر لگا کر اور سفید اونی چادر اوڑھ کر اٹھ بیٹھی۔ اس وقت ایک خاص خوبصورتی اس کے ہر عضو میں پیدا ہو گئی۔ اور میں دل و جان سے قربان ہونے لگا۔ آہ! میری عصمت مآب پیاری ۔ ۔ ۔

ہم نہایت خوشی کے ساتھ بولتے اور ہنستے رہے۔ ہمارا خوف اور غم نظروں سے الگ کر لیا گیا۔ اور تھوڑی دیر کے لئے ہم ان کو بھول گئے مگر بہت ہی تھوڑی دیر کے لئے۔

کمرہ سنہری روشنی میں ڈوبا ہوا اور دریچہ مغرب کی طرف کھلا تھا۔ جس سے ہم نے آفتاب کو چکا چوند کر دینے والے رنگ کی آب و تاب کے ساتھ ڈوبتے ہوئے دیکھا۔ اسی وقت میری دلربا نے کہا "وہ کیا ہے جو لوگ کہتے ہیں؟

"جو دیوتاؤں کے پیارے ہوتے ہیں۔ وہ کم سن مرتے ہیں" یہ میرے لئے ایک اچھا خیال ہے، ہے نا؟"

میں نے اپنی دلربا کی طرف، جو حقیقت میں کمسن اور ایسی تھی کہ دیوتا اس کو پیار کریں۔ حسرت کی نگاہوں سے دیکھا۔ اور فوت واہمہ نے مجھے سنہرے آسمانوں کی سیر کرائی۔ جہاں میں نے اپنی دلربا کو ہوا میں معلق پھول کی اس پتی کی طرح جسے ہوا نے پھولوں کے ہجوم سے اڑا لیا ہو ٹھیرا ہوا دیکھا۔

وہ اب فرشتہ معلوم ہونے لگی۔ اور اس کے چہرے پر ایسے انوار برسنے لگے جیسے آج تک بر و بحر میں کہیں بھی نظر نہیں آئے۔

تب خوف نے آکر میرا دامن پکڑا۔ اور میں اس نازک صورت کے پاس جا بیٹھا۔ میں نے اس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ میرے سینے سے لگی ہوئی گل سوسن

کی طرح سفید معلوم ہوتی تھی اس کی آنکھیں نیم باز اور سانس کمزور تھی

آفتاب کے غروب ہونے کی رونق گندمی اور کہربائی مرغزار پر سے، جہاں ہم اکثر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ٹہلا کرتے تھے۔۔۔ جہاں، افسوس اب کبھی نہ ٹہلیں گے۔۔۔ مٹتی جا رہی تھی جب شفق کی وہ تمتماہٹ تاریکی کے ارغوانی رنگ سے بدل گئی تو میں نے اپنی دلربا کے چہرے میں بھی ایک عجیب تغیر دیکھا اس نے اپنے سفید اور کمزور ہاتھوں کو میری گردن میں ڈالنے کی کمزور سی کوشش کی اور میں نے اس کو دھیمی آواز میں کہتے سنا "پیارے خاوند، میرا بوسہ لو"

اُف! اُن سرد اور خشک ہونٹ، جن کو میرے لب کچھ بھی گرم نہ کر سکے! اس آخری بوسے نے، افسوس، حیات کو موت سے ملا دیا!

آہ! کیوں نہ میرا دل بھی اسی وقت اس صدمے سے پاش پاش ہو گیا اور کیوں نہ میں بھی اس کے ساتھ ہمیشہ کے لئے سو گیا؟

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ایسا نہ ہونے کی کیا وجہ تھی

"میری پیاری، میری پیاری، ایک مرتبہ تو اور بولو۔۔۔ دھیمی آواز میں سہی صرف ایک ہی لفظ سہی!"

آہ۔ آہ۔ کوئی جواب نہیں! اب فرشتے کس پر حسد کریں گے؟

(وزارت حسین اوریئنٹ)

(اُردوئے معلیٰ)

شاعر کا دل

۱

قرونِ متوسط میں جب یورپ دریائے جہالت و تاریکی میں غرق ہو رہا تھا ایک امیر گزرا ہے - پرنس روڈولف نام - یہ شخص نہایت شجاع فرزانہ - جری و دلاور تھا - نبرد آزمائی میں طاق حریف کو نیچا دکھانے میں مشتاق - اس کے خدم و حشم کی تعداد کثیر تھی - جنگ آزمودہ غلام بھی اس کے پاس کم نہ تھے کچھ معمول سا ہو گیا کہ راتوں کو لوٹ مار کے لئے باہر نکل جاتا تھا - نہ صرف قرب و جوار کے باشندے بلکہ دور دور کے رہنے والے بھی اس کے خوف سے تھراتے تھے اس کی بے باکی و سفاکی کی دھوم ہو گئی تھی - چھوٹے بڑے سب ہی اس سے کانپتے تھے عمر اگرچہ قریب ساٹھ برس کے پہنچ چکی تھی - لیکن اس سن و سال پر بھی کسی کی مجال تھی کہ اس کو بڈھا کہہ سکے -

اس کا قصر بلند بھی ایک پُر فضا پہاڑی پر واقع تھا جس کے نیچے عالم فریب آبشار و چشمے رواں تھے - محل کے گرد سنگ گلاخ دیوار اور رفیع الشان برج تھے جو حملہ آور یا غنیم کی مزاحمت کی نوبت تو کجا ہوائے گرم و تند کو بھی خانہ باغ کے اندر آنے نہ دیتے تھے شہزادہ جب کسی مہم سے واپس آتا تو تکان سفر دور کرنے کے لئے اس چمن میں چلا آتا اور کسی روش پر درختوں کے سایہ

میں بیٹھ کر جی بہلایا کرتا۔ مل سے لشکر کشی، معرکہ آرائی کی تکلیفات اور انتقام و جنگجوئی کے خیالات بھلاتا۔ سرو قامت، پری چہرہ، حوریں حاضر ہوتیں اور یکے بعد دیگرے راگ و رنگ سے اس کو خوش کرنے کی کوشش کرتیں۔ یہ وہ بد نصیب نازپروردہ خواتین تھیں جو اس ظالم کے دام ستم میں شکار یا کسی شب خون میں گرفتار ہو کر آتی تھیں بایں ہمہ اس بدمزاج سنگدل پر ان کی رضا جوئی کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا اگر اتفاقیہ کسی بات پر کبھی خوش بھی ہو گیا تو وہ مسرت تک کے۔ شہزادہ نے اپنے یہاں ایک جادوگر کو ٹھیرا رکھا تھا۔ ذاتی معاملات میں اسی سے رجوع کرتا۔ اور آنے والی باتوں کو اکثر پوچھتا رہتا تھا۔ جب کوئی تشویش لاحق ہوتی۔ یا دل پر ملال ہوتا تو اس سے یہ سوال کرتا۔ کہ "دل نہ جانے کیوں درد اٹھا۔ آنکھوں میں آنسو کیوں آئے؟" ساحر کہہ دیتا کہ "آپ کا گوشۂ دل خالی و فارغ ہے جب اس گل میں بوئے محبت پیدا ہو جائے گی تو غم خود دور ہو جائے گا۔"

بے چارے رڈولف کے بس میں کیا رکھا تھا۔ کہ وہ دل میں عشق و محبت پیدا کر لے۔ اس کے لیل و نہار تو ہمیشہ جنگ و جدال قتل و قتال میں بسر ہوتے تھے جو حور نژادیں اس کے پنجے میں گرفتار و اسیر تھیں۔ ان کو یہ خانہ زاد کنیزیں سمجھتا تھا پھر یہ کیونکر ممکن تھا۔ کہ ان کے جانب سے قلب میں التفات و کشش پیدا ہو۔

تماشائے قدرت دیکھئے۔ زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا۔ کہ ایک ایسا واقعہ پیش آگیا۔ جس نے رڈولف کے حال کو بالکل بدل دیا دل و دماغ کی کیفیت یک لخت پلٹ گئی۔ زمانہ کے اتفاقات سے۔ اس نے ایک روز اپنے یاروں و سرداروں کو جمع کیا۔ بعد مشورہ فوج کو ہمرکاب لے کر اپنی سرحد کے ایک متمول رئیس پر حملہ آور ہوا۔ بے چارے ادبار رسیدہ غنیم کو قلعہ بند ہونا پڑا۔ کشت و خون بہت ہوا۔ حریف نے بھی داد مردانگی و دلاوری دی مگر بد نصیب نوشتہ تقدیر

سے مجبور تھا - شکست کھائی - فتحمند روڈولف دیو ہیکل گھوڑے پر سوار برہنہ شمشیر
براں ہاتھ میں لئے ہوئے داخل ہوا - ہمراہیوں نے ہر طرف لوٹ مار شروع کر دی - جا
بجا آگ لگائی - آفت زدہ خانہ برباد ہاں کی فریادیں اور آگ کے شعلے آسمان کی خبر
لانے لگے - باشندے عفو و رحم کے خواہاں جان بخشی کے طالب پریشان پھرتے پھرتے
پرنس کے حضور میں بھی پہنچے - مگر وہ نگاہ قہر و غضب کب پھرنے والی تھی - کچھ دیر
کے بعد تعب و تکان سے عاجز آکر شہزادہ نے ایک مکان میں عزم اقامت کیا -
رات کا وقت، آرام کا تقاضا تھا - تنہا رہ گیا - رفیق کو رخصت کیا - جو اپنے کاروبار
و مشاغل میں آزادانہ مصروف ہو گئے - خلوت و تنہائی میں زیادہ وقت نہ گزرا تھا -
کہ روڈولف ایک چیخ سن کر بے تاب ہو گیا - دریچہ سے سر نکال کر دیکھا تو فجر کا اول وقت
تھا - سمت غربی سے ہو کر خط افق پر چاند پہنچ چکا تھا - روشنی مدھم ہو گئی تھی
بادلوں کے گھر آنے سے آسمان پر اور بھی تاریکی چھا رہی تھی - شہر میں چاروں طرف
سناٹا ہو رہا تھا - ہاں کبھی کبھی قریب ہی سے ایک باریک آواز آ جاتی تھی - نگاہ
کے سامنے یہ لٹا ہوا شہر تھا - جس کی ویرانی و بربادی نہایت دل دکھانے والی
تھی - صحنوں میں نعشوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے - گلی کوچوں میں دریائے خوں رواں
تھا - اب اس نے اس طرف توجہ کی - جدھر سے وہ دردانگیز آواز آتی تھی - دیکھا کہ
اس کے بعض لشکری جو نشہ میں بے خود شراب میں سرشار ہیں ایک نوخیز فتنہ
پیکر کو اپنے سامنے کھینچ رہے ہیں - اس کی عمر مشکل سے سولہ سال ہو گی نہایت
نازک اندام، حسن و جمال میں یکتا - مشکیں زلفیں، دوش پر پریشان ادائے
دلربائی دکھا رہی تھیں - چہرہ گلگوں کا رنگ اڑ کر کافوری ہو گیا تھا لباس ماتمی زیب
بر تھا - اس کے انداز و رخ سے پتہ چلتا تھا - کہ دل پر کس قدر خوف و ہراس غالب
ہے - انجلی تمام تھا ان گرگ شعار ستمگاروں کے ہاتھ سے نجات و خلاصی کیلئے

کوشش و التجا کر رہی تھی - وہ اسی کی آہ و زاری ، فغان بے قراری تھی - جو پرنس کے کانوں تک پہنچی تھی - اس کی فریاد نے لڑولف کے پتھر دل میں وہ درد پیدا کر دیا تھا جس کی لذت کبھی پیشتر نصیب نہ ہوئی تھی - جذبہ الفت نے دامن پکڑا - تو شہزادہ کو سیہ کار و سیہ مست درباریوں کے روبرو لے جا کر کھڑا کر دیا - پُر غضب آواز سے حکم ہوا " اس کو چھوڑ دو "

اور سپاہی تو خوف زدہ ہو کر ہٹ گئے - بعض ہوشیار تجربہ کار ادھر اُدھر راستہ ڈھونڈھنے لگے مگر ایک منچلے بہادر نے ہٹنا تو درکنار اس نازنین کا معاملہ سنا لیکن تھی ہاتھ سے نہ چھوڑا - پرنس کی برہمی اور بھی بڑھتی مگر شمشیر براں نے فوراً بے نیام ہو کر فیصلہ کر دیا - البتہ اس ہیبت زدہ کی حالت غیر ہو گئی - ہوش جاتے رہے غش کھا کر شہزادہ کے روبرو گر پڑی

جب کچھ سکون و افاقہ ہوا تو لڑولف اس کو ہمراہ لے کر اپنے محل کو آیا اس کو سارے گھر کا مالک و مختار کیا - صاحب خانہ بنایا - حتیٰ کہ اپنی ذات پر بھی اس کو افضلیت و ترجیح دی - پُر تکلف گراں لباس پہنائے - اجازت دی کہ جو مانگے پائے جو چاہے کرے - اور اس کا معاوضہ بس ایک نگاہ پر ٹھیرا ہے فیصلہ دل کا شہزادہ صرف ایک نظر مہر کا جویاں تھا - اور وہ بے بس تیاک نہاد لڑکی کے قابو سے باہر تھی -

بایں ہمہ رفاہ و آسائش اس کو یہی خلش قائم تھی - کہ ایک زشت خو تند مزاج بوڑھے کے چنگل میں پھنسی ہوں - آخر قیدی ہوں ، اس میں شک نہیں کہ جب سے یہ لڑکی اس گھر میں آئی تھی - شہزادہ کا حال اور ہی ہو گیا تھا - تمام طور و طریق بدل گئے تھے - دل میں تخم محبت جم چلا تھا - بد مزاجی و خشونت بالائے طاق ہر وقت بشاش و متبسم نکھرا بنا رہتا - اپنی اسیرہ سے جس کے دام عشق میں خود اسیر ہو گیا تھا

نہایت لطف و ربط کی باتیں کرتا۔ لیکن یہ حرماں نصیب شہزادہ کا تھوڑی دیر کو بھی مل جانا غنیمت سمجھتی۔ تنہائی پاکر ایام گذشتہ کی یاد میں اپنا جی بہلاتی۔ وہ مبارک دن سامنے آکھڑے ہوتے۔ ان کا خیال تازہ ہو جاتا۔ اس فتنہ دوراں نوجوان کی تصویر زیر نظر ہو جاتی جس کی یہ خود دیوانی تھی۔ وہ مزے مزے کی باتیں وہ جلد گذر جانے والی راتیں یاد آتیں۔ اور زخم جگر پر نمک پاش ہوتی تھیں حسرت یہ تھی کہ وہ ناکام تمنا ناشاد و نامراد پُر ارمان ہمیشہ کے لئے بچھڑ چکا تھا۔ اس کی مفارقت و جدائی دائمی تھی۔ وہ شیر دل جوانمرد تو اپنے شہر کے محاصرہ اور اہل وطن کی محافظت میں جان دے چکا تھا۔ اب اس کا دھیان اور اس کی پیاری باتوں کا تصور چاہے تیر و نشتر کا کام کرتا ہے چاہے تیغ و تبر کا۔ مگر اس کے درد دل کا چارہ نہ ہو سکتا تھا۔

۲

قصہ کوتاہ بہت سے دن۔ بہت سے ہفتے یونہی گزر گئے اس کی حالت بدستور رہی وہی مثل "ایں دل زار ہماں" ایک روز بیٹھے بیٹھے خود ہی اس کو خیال گذرا اگر یہ جفا پیشگی تو کسی طرح شایاں مروت نہیں۔ جس نے اتنا بڑا اکرم فرمایا ہو جس نے بے رحم ظالموں کے پنجہ سے مخلصی دلائی ہو۔ ایسے محسن سے ایسی بے رخی زیبا نہیں زیادہ نہ سہی لڈولف کے الطاف و اکرام کا تو احسان ماننا چاہیے۔ گذرنے والا زمانہ گذر چکا۔ پھر لوٹ کر نہ آئے گا۔ آئندہ کا اعتبار نہیں۔ کچھ تو کیا چاہیے بے چین۔ بے صبر دل سمجھنے والا نہ تھا۔ تاہم حتے الوسع اپنی طرف سے اُنس و ربط میں دریغ نہ کرتی۔ شہزادہ تو پہلے ہی سے گرویدہ و شیدائی ہو رہا تھا اب بالکل مفتون و دیوانہ ہو گیا۔ آنجل کے لئے بزم سرور بمبار رہتی۔ اس کے حسن بے مثال کی مدح سرائی کرکے شعرا صلے پاتے ہر قسم کے اسباب طرب اور

مشاغل لہو و لعب مہیا رہتے - اس کی رضا جوئی کا کوئی پہلو اٹھا نہ رکھا گیا تھا - لیکن یہ سب ناؤ نوش رفاہ و عیش سخت جان انجل کے لیئے بے کار و ہیچ تھا - وہ دل میں محبت پیدا کرنے سے مجبور تھی - دل است ایں جنگ نتواں کرد با دل

اس مرتبہ خلاف معمول پرنس بہت عرصہ تک محل سرا میں اقامت گزیں رہا - محض اپنے اس نو اسیر کی التیام اور موانست کے لئے - خیر جب کچھ شکل امید نظر آنے لگی - اور شہزادہ محل کے قیام اور شکستہ پائی سے اکتا گیا - تو پھر جنگ و جدل کے ولولے تازے ہو گئے - سیر و شکار کے لئے چل نکلا -

یہ نو گرفتارِ بلا محل میں تنہا رہ گئی - وہ پورا دن گذرے ہوئے دنوں کی یادیں کاٹ دیا - جب آفتاب پردہ حجاب میں پہنچا - اور فلک زرنگاریں پر زرنگار تارے چھلک گئے - فضائے عالم میں سناٹا ہو گیا - باغ میں صرف ایک آواز آبشار سے پانی کے جھرنے کی کان میں آتی تھی - انجل کی نگاہ اتفاقاً آگ پر پڑی جو دامن کوہ پر ایک جگہ چشمے کے اس پار روشن تھی - اس کے ساتھ ساتھ کچھ آواز بھی آ جاتی تھی - جیسے کوئی رباب پر گاتا ہو - حواس کو مجتمع کر کے ہمہ تن اس طرف متوجہ ہو گئی - وہ لذت پائی جو اس سے پیشتر پرنس کے محل میں نصیب نہ ہوئی تھی - ایک خواجہ سرا کو بھیج کر اس آدمی کو بلوایا - جو ایک نوجوان شاعر تھا - نہایت حسین آثار ذکاوت و ہوشمندی نمایاں تھے جسم پر سمد حسن کے گاڑھے کا ایک موٹا کرتا - سر کے بال پریشان - بڑی بڑی آنکھیں مگر نہایت رسیلی - انجل کی خواہش سے اس نے چند اچھے اچھے اشعار راگ میں سنائے جن کا مضمون صرف ترغیب و ترہیب کا تھا - تمام کلام حقانیت عدل و محبت شرف و جمال حقیقت سے معمور تھا - دیر تک یہ بزم شعر و سرود قائم رہی - اس اثنا میں چاند نکلا - اور ڈوب بھی گیا - فجر ہو گئی لیکن انجل اسی طرح سراپا لذت و شوق - ہمہ تن گوش سن رہی تھی - آخری راگ جو چھیڑا گیا وہ ترک دنیا پر تھا - اس عالم فانی اور

اس سے دل نہ لگانے بلکہ ان امور میں پامردی و استقامت کی نصیحت کتھی جن سے انسان درجات کمال و ترقی پر پہنچ سکے کہنے والا تو کہہ کر چل دیا۔ لیکن انجل بدستور عالم سکوت میں محو حیرت بیٹھی رہی۔ کبھی اس کے حسن و جمال کا دھیان آتا کبھی اس کی آواز کی نرمی و نزاکت کا کبھی اس کے حرکات کی عمدگی و شرافت کا تصور کرتی۔ کبھی مضامین کی چستی، الفاظ کی بندش اور کلام کی خوبی کی تعریف کرتی کبھی خود بخود دل کو ملامت کرتی کہ ناحق اس ناقہم کج رفتار کو سمجھایا۔ اور رہبرستی کی محبت کے لئے مجبور کیا تھا۔

۳

چند روز اسی طرح گذرے۔ شاعر روزانہ باغ میں آتا۔ انجل بھی شریک حال ہوتی وہ نادر اشعار لذت افروز سروں میں سنایا کرتا تھا۔ جب شہزادہ سفر سے واپس آیا۔ تو بڑی عجلت و تپاک سے اپنی محبوبہ کے دیکھنے کے لئے بڑھا۔ وہاں جاکر دوسری حالت پائی۔ نیا انقلاب دیکھا۔ اپنی جانب سے بے قراری و گریز محسوس کرکے متحیر رہ گیا۔ باوجودیکہ قلوب نسوانی کی کیفیت جان لینے کا اس کو تجربہ نہ تھا۔ سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ یہ تغیر و انقلاب اس وجہ سے ہے کہ "معشوق عاشق ہوا غیرے پر"۔ اس کے دل پر کسی نے قابو پالیا۔ اور اپنے جانب مائل کر لیا ہے فکر ہوئی کہ وہ دشمن خانہ برانداز کون ہے یہ ہر وقت کیوں متفکر و مضطرب رہتی ہے نہ کوئی بات سمجھ میں آتی۔ نہ کسی شخص کی طرف ذہن منتقل ہوتا تھا۔ بات یہ تھی کہ پچھلے چند دنوں کو چھوڑ کر بارہ دو سال تک شہزادہ خانہ نشین رہا تھا۔ محل کے باہر قدم بھی نہ نکالا تھا۔ اپنی عقل کی نارسائی سے تنگ آکر وفعتہً اس صاحبہ کی طرف متوجہ ہوا جس کو سب سے بلند برج میں کھڑا رکھا تھا۔ شہزادہ کو آتے ہوئے دیکھ کر یہ بھی تپاک سے کھڑا ہو گیا اور ادھر اُدھر کا سلسلہ گفتگو شروع کیا۔

"حضور کی تشریف آوری کی وجہ مجھ کو معلوم ہو چکی ہے۔ شاید یہ دریافت کرنا منظور خاطر عالی ہے۔ کہ آپ کی محبوبہ کی حالت میں کیوں تغیر ہو گیا۔ اس کے برتاؤ میں کیوں فرق آگیا ہے۔ اب آپ کے ساتھ التفات و توجہ کیوں نہیں کرتی۔ اصل یہ ہے۔ کہ اب وہ کسی اور سے محبت کرنے لگی ہے۔ حضور کی سی دنیوی اور غرضمندانہ عشقبازی نہیں بلکہ سچی اور پاک محبت"

پرنس نے زیر خند تبسم کے ساتھ عرض کیا" میرا گمان تو اس کے خلاف ہے۔ وہ محبت نہیں جو آپ فرماتے ہیں ضرور وہ نافرجام کسی اور کو چاہتی ہے۔ بے وفا نے مجھ سے خیانت کی ہے۔ اس پیمان شکن نے کفرانِ نعمت کیا ہے۔ خدا کے لئے بتا دیجئے کہ وہ میرا دشمن کون ہے"

ساحر نے جواب دیا" حضور کا بد اندیش کوئی نہیں۔ رہا وہ شخص جس نے یہ نازک حالت آپ کی محبوبہ کے دل میں پیدا کر دی ہے اس کی کیا جرات ہو سکتی تھی کہ جو آپ کی حمایت و سرپرستی میں ہو اس کو نگاہ بد سے دیکھے۔ وہ نکوکار تو اس کو ہمیشہ خدا شناسی، خیرات، نیکی، صلاحیت کی باتیں بتا رہا ہے۔ اور سریع الزوال دنیوی امور کی حقیقت، واہیت سے آگاہ کر تا رہا ہے"

شہزادہ کو نہایت غصہ آیا۔ خشمگیں لہجہ میں بولا" آپ بالکل جھوٹ کہتے ہیں۔ جو کچھ میرے محل سرا میں ہو رہا ہے۔ اس سے آپ خوب واقف ہیں۔ بہتر ہے کہ مجھے بے کم و کاست بتا دیجئے۔ ورنہ آپ کی جان بچ نہیں سکتی"

یہ کہہ کر خنجر براں کمر سے کھینچ لیا۔ اور ہاتھ میں لے کر ساحر کی طرف جھپٹا۔ مگر ہوشمند دیرینہ سال بجائے خود ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ شہزادہ کو کچھ جواب نہ دیا البتہ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ گویا زبان حال سے کہہ رہی تھیں کہ اگر اس کو مار ڈالو گے تو پھر تم کو کون بتانے آئے گا؟

خنجر آبدار شہزادے نے رکھ دیا۔ جادوگر بڑھا۔ رڈولف کا ہاتھ پکڑ کر ایک جانب لے گیا۔ جہاں سے سارا باغیچہ زیر نظر تھا۔ رات ہوگئی تھی۔ چاند کی روپہلی شعائیں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ سنہری روشنی بہار دے رہی تھی۔ طبائع عالم میں سکون تھا۔ ہاں اس پہاڑی کی آبشار کا سراٹا کبھی کبھی سن پڑتا تھا۔ جس سے شہزادے کا ہیجان اور تفکر اور بھی بڑھتا جاتا تھا۔ انجل ایک خیمہ میں بیٹھی ہوئی تھی جس کے ہر سمت گلاب و یاسمن رکھے ہوئے تھے۔ ایک پہلو میں شاعر اپنا چنگ بجا رہا تھا۔ اس کی نازک آواز خوب گونج رہی تھی۔ اور نغمے دور دور تک سن پڑتے تھے

اب شہزادہ کے غیظ و غضب کی کیا انتہا تھی اتنے میں گانا دفعتاً بند ہوگیا۔ آہستہ آہستہ کچھ گفتگو ہوئی۔ جو سمجھ میں نہ آسکی۔ مگر اتنا نظر آیا۔ کہ شاعر نے اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھا کر کچھ اشارہ کیا۔ چہرہ اس کا نہایت نورانی تھا۔ جس سے طمانیت صلاحیت و تقویٰ برستا تھا۔ ادب و احترام کے ساتھ اس نے انجل کے قریب آیا اور اس کا دست رنگیں اپنے لب ہائے زعفرانی پر رکھ دیا۔

انجل اسی تمکنت و شان سے بیٹھی تو رہی مگر اس کی طرف جھک گئی اور اپنے گرم گرم ہونٹ شاعر کے لبوں سے ملا دئے۔

شہزادہ بالائے برج سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اور دل میں آتش سوزاں موجزن تھی۔ اتفاق دقت کنا چاہئے۔ کہ ادھر شاعر کے ہاتھ میں وہ دست نازک سیم بر تھا۔ ادھر اس کے قبضہ میں سنگلاخ دیوار کا فقط ایک پتھر۔

جب کچھ سکون ہوا تو شہزادہ نے پھر گہری نظر ڈالی اب خیمہ میں تنہا انجل تھی مگر اس کی نگاہیں شاعر کی طرف برابر لگی ہوئی تھیں۔ گویا جانے والے رفیق کی مشایعت کر رہی تھیں۔ غنا و سرود کی آواز جو ہنوز فضائے عالم میں باقی تھی رفتہ رفتہ کم ہوتی جاتی تھی۔ شہزادہ کا غصہ حد سے بڑھ چکا تھا۔ خشمگیں رڈولف نے ساحر کو اپنے

ہاتھ سے ہٹا دیا اور شاعر سے ملا۔

۹

خیر یہ رات بھی گذر گئی۔ دن نکلا بھی اور چھپ بھی گیا۔ تاریکی چھاگئی۔ کرہ ارض پر اندھیرا پھیل گیا۔ شہزادہ اسپ مشکیں فام پر سوار واپس قلعہ آیا۔ ڈیوڑھی پر پہنچ کر پشت زریں سے اترا۔ وفادار رفیق کو سائیس کے حوالہ کیا۔ شہزادہ کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی۔ جس کو وہ دامن میں لپیٹے ہوئے تھا۔ پہلو میں شمشیر دودم خون تازہ سے تر تھی۔ سیدھا انجل کے کمرہ میں پہنچا۔ یہ اس کھڑکی کے قریب بیٹھی ہوئی تھی جس کے نیچے صحن گلشن تھا۔ شہزادہ کو دیکھ کر اس کے تیور پہچان گئی۔ لڈولف نے دامن پھیلایا۔ جام بلوریں میں کسی انسان کا قلب تھا۔ جس میں تڑپ بھی باقی تھی اور خون بھی رواں تھا۔ اس سہمی ہوئی عورت سے مخاطب ہو کر بولا۔

"میں نے کل شب میں خود تجھ کو اس اجل گرفتہ شاعر کے ساتھ خلوت میں دیکھ لیا ہے۔ تو نے مجھ سے خیانت کی۔ میرے انعامات کو بھلا دیا۔ احسانات کو محو کر دیا اب جلد کیفر کردار کو پہنچے گی۔ پارہ نان کو محتاج و تنگدست تھی میں نے ہی تجھ کو بے نیاز ذی مقدور و خوشحال بنا دیا۔ تاہم تو نے مجھ سے فریب کیا۔ مجھ سے اعراض کیا۔ میرے سواد و سرے سے لگاوٹ اختیار کی۔ دیکھ لینا تجھے کتے کی موت ماروں گا۔ بھوکی پیاسی تڑپ تڑپ کر اکیلی مرے گی۔ اب نہ وہ عیش و عشرت کے نغمے سننے ملیں گے۔ نہ چشم فسوں ساز کے کرشمے دیکھنے پائیگی۔ جن سے تیرے عقل و ہوش گم ہوں اور تو مجھ سے بے زار ہو جائے۔ اے کافر نعمت"

غمزدہ انجل کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ نہایت دردناک آواز سے آہستہ آہستہ بولی "میں نے تو حضور کا کوئی قصور نہیں کیا۔ نہ کوئی خیانت کی نہ حضور کے عہد کو توڑا۔ ہاں میرے قتل کا ہر وقت اختیار ہے"

شہزادہ نے بڑے ضبط و استقلال کے ساتھ کہا "میں تیرے آشنا کو قتل کر کے ابھی اس کا دل نکال لایا ہوں۔ امید ہے کہ میرے کہنے سے ساحر اس میں پھر جان ڈال دے گا۔ اور میں اس سے انہیں ولولہ انگیز نغمات کی فرمائش کروں گا جو اس نے تجھے دم رخصت سنائے تھے۔ اگر ان سے تیری برات ظاہر ہوگی تو خیر در گذر کروں گا۔ لیکن مجھے تو کامل یقین ہے کہ تو جھوٹی ہے یہ دعویٰ پارسائی کیسا۔ میں نے تو خود دیکھا تھا۔ کہ تو نے اپنے لب اس کے رخسار سے لگا دیئے تھے۔"

وہ اتنا کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ انجلی کو اپنی بے گناہی اور پاکدامنی کے بارہ میں کچھ بھی کہنے نہ دیا۔ اسی طرح فرش پر اس کو از خود رفتہ لیٹا چھوڑا۔ چلتے وقت دروازہ بھی بند کرتا گیا۔

۵

پرنس اپنے ہاتھ میں وہی ظرف پُر خون سا لئے چلا جاتا تھا۔ جس میں شاعر کا دل رکھا ہوا تھا۔ ایوان خاص سے گذر کر ایک وسیع کمرے میں داخل ہوا۔ جو چاروں سمت سے بلند احاطہ سے محفوظ تھا۔ اس ہال کے وسط میں آگ رکھی ہوئی تھی جس میں کبھی کبھی خفیف چمک خود بخود ہو جاتی تھی۔ اس کے آس پاس کرسیاں چوکیاں، تخت اور صوفے بچھے ہوئے تھے۔ جا بجا فرشی شمعدان۔ جادو کا سامان اور دیگر متفرق چیزیں تھیں۔ ادھر ادھر کچھ پریشان ورق پڑے تھے۔ ایک گوشہ میں اگلے زمانے کی پرانی کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔ جس کے سامنے کھوپڑیوں اور بوسیدہ ہڈیوں کا ڈھیر تھا۔ آگ کے قریب ایک برتن میں کئی قسم کی بخورات اور کچھ جڑی بوٹیاں رکھی تھیں۔ دیواروں پر قدیم وضع اور ساخت کے اسلحہ بد سلیقگی کے ساتھ آویزاں تھے۔ جن پر پرچے لگے ہوئے تھے۔ مگر ان کی تحریرات

مبہم اور نشانہائے خطوط مختلف و عجب تھیں ظاہر ہے کہ یہ شیرازہ پریشان محض جادو کا دفتر یا طلسمی کارخانہ تھا۔ آگ کے ایک جانب وہی بزرگ دیرینہ سال چار زانو بیٹھا ہوا تھا۔ عبائے مبارک کاندھوں پر پڑی ہوئی اور ہاتھ میں لوہے کی ایک پتلی چھڑی تھی جس کا ایک کنارہ آتشدان میں تھا۔ پیر مرد اسی سے آگ کو چھیڑتا جاتا تھا۔ آگ سے سبز رنگ کی روشنی پیدا ہوتی تھی۔ اور نہایت لطیف اور فرح بخش خوشبوئیں نکل رہی تھیں

جب ان بزرگوار کی نظر شہزادہ پر پڑی۔ تو بے ساختہ اس ظرف خون آلود کی طرف اشارہ کر کے کہا "آپ نے یہ کیا کیا۔ کیا میں نے آپ سے کہہ نہیں دیا تھا کہ یہ غریب شاعر بے گناہ ہے محض آپ کے رشک نے یہ سب تصورات باطل قائم اور خیالات فاسد ذہن نشین کر دیئے ہیں۔ جو کچھ ہوا بہت برا ہوا ہوشیار رہیئے گا۔ کہ اس فعل بد کی پاداش آپ کو قوت عظیم سے ضرور ملے گی۔ لیکن اگر یہ دریافت کرنا مکنون خاطر ہے کہ اس نیک نفس نے آپ کی محبوبہ سے کیا کہا تھا۔ تو میں تھوڑی دیر کے لئے اس کو زندہ کر سکتا ہوں۔ اور جو جو نغمات و ترنم اس نے ہنگام رخصت سنائے تھے وہی پھر اس وقت کہہ سنائے گا۔ اسی دل کی باتیں جو تھیں اسی دل سے پھر نکلیں گی۔ ہاں بہتر تو یہی ہے کہ ایسا نہ کریں۔ ورنہ آپ کو بڑی بڑی آفتوں کا سامنا ہوگا"

پرنس بولا "میری خواہش تو یہی ہے۔ کہ حقیقت حال سے آگاہ ہو جاؤں خیال فرمایئے اب اس سے زیادہ کون آفت آئے گی۔ اس سے بڑھ کر کیا مصیبت پڑے گی کہ میری اسیر دام نے خود مجھ سے کور نمکی کی مہربانی فرما کر اس قلب میں جان ڈال دیجئے تاکہ مجھ کو اصل معاملہ تو معلوم ہو جائے"

ساحر کچھ دیر خاموش رہا پھر تو تلا تو تلا کر زیر لب کچھ پڑھنے لگا۔ اسی حال میں

لاڈولف کے ہاتھ سے وہ خون بھرا ہوا شیشہ لے لیا۔ اور آگ والے ظرف پر اس کو لوٹ دیا۔ اس میں شاعر کا دل تھا۔ ظرف کے اندر جو مصالحہ وسامان تھا اسی میں یہ بھی گرا۔ گرنے کے ساتھ ہی بڑے زور سے ایک آواز آئی۔ جیسے بادل تڑپ کر گرجتا ہے۔ آگ پر سیدھا سیدھا دھوئیں کا ایک شہتیر سا کھڑا ہوگیا۔ دھواں تمام کمرے میں بھر گیا تھا۔ اب ساحر کو اور بھی عجلت ہوئی۔ آہنی حربہ جو ہاتھ میں تھی اس سے ایک حلقہ کھینچا اس میں خود معہ پرنس کے کھڑا ہوگیا۔ برابر منتر پڑھتا جاتا تھا۔ اس ظرف سے جو دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ مائل بہ سبزی ہونے لگا۔ حتےٰ کہ اوپر تک پہنچ کر ٹھیر گیا۔ پھر اس نے سایہ کی رنگت اختیار کی اور اس کے بعد اچھے خاصے انسان کی ہیئت بن گئی۔ رفتہ رفتہ یہ شکل اس دائرہ کے پاس آگئی جس میں جادوگر اور لاڈولف پناہ گزیں تھے۔ اب پرنس کے روبرو یہ کالبد کھڑا ہوگیا اور خشمگیں نگاہیں ڈالنے لگا۔ جو پرنس پر تیر و تبر سے بھی زیادہ کام کرتی تھیں۔ شہزادہ بھی اس کالبد کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہی شاعر ہے جو میرے ہاتھ سے ہلاک ہوا۔ اور بعینہٖ اسی حالت میں جو قتل سے پیشتر اس کی تھی۔ حسب معمول قبا و رباب، دوش پر آویزاں تھے فرق صرف اس قدر تھا۔ کہ آنکھوں میں وہ نور و جمال باقی نہ تھا ان کا منظر نہایت خوفناک و مہیب تھا۔ چہرہ سے سختی و پریشانی ٹپکتی تھی۔ آثار درد والم نمایاں تھے۔ ساحر جو منتر پڑھ رہا تھا۔ اس کے حل و اثر سے وہ کالبد پیچ و تاب کھا کر رک گیا کچھ توقف کر کے رباب اتارا اور چھیڑنے کے لئے تیار ہوا۔ ساحر نے شہزادہ کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا "فرمایئے آپ کیا سننا چاہتے ہیں؟"

جواب دیا "وہی ترانے جو چلتے وقت زبان پر تھے۔ جب یہ انجل اس کی طرف جھک گئی تھی۔ اور اس کا بوسہ لے لیا تھا۔"

ساحر پھر کچھ تو تا کر پڑھنے لگا۔ کالبہ کی یہ حالت ہو گئی - جیسے کوئی نیند سے چونک پڑتا ہے۔ چنگ پر انگلیاں تیز چلانے اور اپنی دھن میں وہی گانے لگا جو انجل کے روبرو آخر وقت گایا تھا۔ شہزادہ پر اس کا بے حد بے انتہا اثر ہوا۔ بد نصیب وہ آخری کلمے بھی نہ سن سکا جو اس کالبہ نے سنانے تھے۔ کالبہ کے پکڑنے کو جھپٹا مگر کالبہ ایک آن میں نگاہ سے غائب تھا۔ دھواں سارے کمرے میں بھر گیا تھا کچھ دیر میں کمرے کی حالت بھی معمولی ہو گئی۔ لارڈ ولف نے آگ والے ظرف پر نگاہ ڈالی تو سوائے راکھ کے اس میں کچھ نہ تھا۔

۶

یہاں سے نکل کر پرنس نے انجل کے محل سرا کا قصد کیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا کوئی جواب نہ ملا۔ زنجیر در ہلائی بیکار ہوا۔ دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ ناکام رہا۔ ناچار دروازہ توڑ کر اندر گھسا۔ انجل کو ڈھونڈنے لگا۔ کچھ پتہ نہ چلا۔ سراغ نہ ملا البتہ ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اور اس میں ایک رومال پُر نم پڑا تھا۔ ضرور آنسوؤں سے تر ہوا ہوگا۔ اس کو اٹھا کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ اور غش کھا کر زمین پر گر پڑا۔ حوالی موالی دوڑے گئے۔ اٹھایا تو جسد بے حرکت و جسم بے جان تھا۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ اس کمرہ کی کھڑکیوں کے نیچے شفاف چشمے بہتے تھے پانی کے جھلکوروں کی آواز دُور دُور سے سن پڑتی تھی۔ موجوں کی تیزی اور روانی بتا رہی تھی۔ کہ آج کسی نیک نہاد و پاکیزہ قربانی کے چڑھنے کی مسرت و شکر گزاری ہے۔ دوسرے دن اس آبشار نے محل کے ایک جانب ایک نعش باہر نکال کر ڈالی جو لارڈ ولف کی پیاری انجل کی تھی اور قصہ تمام کیا۔ افسوس ؎

بیداد عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ

(سید مقبول احمد) جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا (مخزن)

منشی جی

۱

منشی محمد الدین کچہری میں نقل نویس تھے - ان کی آمدنی بہت معمولی اور کنبہ بہت بڑا تھا - چالیس سال کے قریب عمر تھی - مگر پچپن برس کے معلوم ہوتے تھے - نظر کمزور تھی - اور ہر وقت بیٹھے رہنے کی وجہ سے کمر بھی خم کھا گئی تھی بہت ہی خشک مزاج تھے - ماتھے پر ہمیشہ بل پڑے رہتے گھر میں سب ان سے خوف کھاتے تھے انہوں نے صحن میں قدم رکھا اور سب کا ہنسنا بولنا بند ہو گیا ہر طرف خاموشی چھا گئی -

لوگوں کا خیال تھا - کہ منشی جی کی فطرت ہی ایسی ہے لیکن حقیقت یہ تھی کہ جوانی کے زمانے میں منشی جی اپنے ہم عمر لوگوں میں طبیعت کی رنگینی اور تخیل کی جولانیوں میں کسی سے کم نہ تھے - زمانے کے اتفاقات نے انہیں مجبور کر دیا تھا - کہ وہ اپنی خواہشات کو دبائیں - اور خشک مزاج بن جائیں - رنگینیوں کو قائم رکھنا صرف ایسے شخص کے لئے ممکن ہے - جسے غم روزگار سے اور دنیا کے دوسرے تفکرات سے آزادی حاصل ہو یا وہ ایسا شخص ہو جو اپنے فرائض کا احساس نہ رکھتا ہو منشی جی کی تربیت ایسی تھی کہ اپنے فرائض کو پورا کرنے کی کوشش کئے بغیر ان کا ضمیر انہیں چین سے بیٹھنے نہ دیتا تھا - اسی وجہ سے وہ اپنی خوش فکریوں کو کھو بیٹھے تھے - تاہم اب تک ایک چیز سے ان کی دلچسپی باقی تھی - اور وہ چیز شعر خوانی تھی -

منشی جی کا قاعدہ تھا۔ ہر روز شام کو لائبریری میں جا کر بیٹھا کرتے۔ اور مقامی اخبار کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ وہ مقالہ افتتاحیہ سے لیکر پرنٹر پبلشر تک سب پڑھ جاتے۔ مطالعہ کے دوران میں بالکل ساکت بیٹھے رہتے۔ اور ان کے چہرے سے تعجب حیرت یا دلچسپی کسی چیز کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ انہماک کا عالم ضرور ہوتا تھا لیکن آپ کو یہ احساس نہ ہو سکتا تھا۔ کہ وہ واقعی اخبار کے مطالعہ میں منہمک ہیں بلکہ یہ اس بات کا ثبوت تھے۔ کہ وہ محض ایک فریضہ پورا کرنے کی غرض سے اخبار پڑھ رہے ہیں۔

وہ روز لائبریری میں آتے تھے۔ اور لوگ ان سے خوب واقف تھے۔ ان کے آتے ہی وہ اخبار چھوڑ کر الگ ہو جاتے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا۔ کہ اخبار پڑھتے پڑھتے منشی جی کے لبوں پر ایک ہلکا سا تبسم نمودار ہو جاتا۔ لوگ سمجھ جاتے تھے کہ آج اخبار میں ضرور کوئی اچھا شعر لکھا ہے۔ اور منشی جی کے جانے کے بعد اس شعر کو اخبار میں ڈھونڈا کرتے تھے۔ اور اس طرح سے انہوں نے اندازہ لگایا تھا۔ کہ منشی جی شاعری کے متعلق بہت صحیح ذوق رکھتے ہیں۔ ان کی وضع داری اور متانت کی وجہ سے ہر شخص ان کا ادب کرتا۔ اور ان سے خوف کھاتا تھا۔

۲

ایک دن شام کو منشی جی لائبریری میں تشریف لائے۔ تو کچھ نوجوان دیوان غالب کے ایک باتصویر مرقع کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ اور تصویریں دیکھنے میں محو تھے۔ منشی جی اخبار پڑھنے میں مشغول تھے۔ لیکن آج خلاف معمول ان کی نگاہیں بار بار نوجوانوں کے اس گروہ کی طرف اٹھتی تھیں اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ دُور ہی سے کتاب پر جلی قلم سے دیوان غالب کا باتصویر مرقع لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ آخر ان سے نہ رہا گیا۔ اٹھ کر ان نوجوانوں کے پاس آئے اور کہا میں کیا میں

ذرا اس دیوان پر ایک نظر ڈال سکتا ہوں؟ نوجوانوں نے دیوان پیش کر دیا۔ منشی جی نے ورق پلٹنے شروع کئے۔ کہیں کہیں سے کچھ اشعار پڑھے۔ اور فرمایا "بہت صحیح نسخہ ہے طباعت اور کتابت بہت نفیس ہیں۔"

"جی ہاں" نوجوانوں نے کہا۔

"دیکھیئے گا۔ میرے پاس ایک نسخہ ہے جو میں نے ایک معمولی کتب فروش سے خریدا تھا۔ وہ سراسر غلطیوں سے پُر ہے مثلاً غالب کا یہ شعر ۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

اس نسخہ میں اس طریقہ سے لکھا ہے ۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرقت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

ایک لفظ بدل کر تمام شعر کا ناس کر دیا۔ کہاں فرصت اور کہاں فرقت لیکن اس نسخہ میں ایسی غلطیاں نہیں ہیں ۔ ارادہ ہے کہ ایک جلد خرید لوں"

"لیکن" ایک نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا "اس کی قیمت ایک سو بیس روپے ہے۔"

منشی جی کے ماتھے پر شکن پیدا ہو گئے "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں قیمت سے ڈر جاؤں گا۔ غالب کے دیوان کی قیمت اس سے کم ہونی بھی نہ چاہئے" یہ کہہ کر منشی جی اپنی جگہ پر چلے گئے ۔ اور اخبار پڑھنے لگے ۔ اگرچہ وہ ڈیڑھ گھنٹے کے قریب وہاں بیٹھے رہے ۔ لیکن اخبار کا ورق نہ پلٹا۔ وہ اخبار پڑھ ہی نہ رہے تھے ۔ ان کے دماغ میں غالب کے اشعار چکر لگا رہے تھے ۔ اور وہ دیوان غالب کا باتصویر مرقع خریدنے کی تدابیر پر غور کر رہے تھے ۔

ایک سو بیس روپے! اگر وہ چھ ماہ تک اپنی تنخواہ میں سے کچھ خرچ نہ کریں تو ایک سو بیس روپے جمع ہو سکتے ہیں۔ لیکن چھ ماہ تک روٹی کپڑا، بچوں کا خرچ مکان کا کرایہ، بیماری اور دیگر ضروریات کو پورا کرنے کی کیا صورت ہو سکتی تھی! منشی جی نے سوچا کیا حماقت ہے اگر میں دیوان غالب کے باتصویر مرقع کو دیکھنا چاہوں تو لائبریری میں آکر روز دیکھ سکتا ہوں۔ اسے اپنے پاس رکھنے سے کیا فائدہ؟ لیکن نسخہ بہت صحیح تھا۔ اور مدت العمر کے بعد منشی جی کے دل میں اپنی ذات کے لئے کسی چیز کو حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ اور وہ خواہش بھی کسی بڑی چیز کی نہ تھی۔

"کیا یہ بھی پوری نہ ہو گی؟" منشی جی نے کہا "ضرور پوری ہو گی۔ اگر میں ارادہ کر لوں تو کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی۔ میرا ارادہ اس قدر مضبوط ہے کہ آج تک کوئی چیز میرے ارادہ کے خلاف نہیں ہو سکی"

بہرحال اپنی منطق پر عمل کرتے ہوئے منشی جی نے دوسرے روز ہی ڈاک خانہ میں حساب کھلوا لیا۔ اور بیوی سے ایک روپیہ لے کر وہاں جمع کر دیا۔ بیوی کو معلوم نہ تھا۔ کہ منشی جی نے ایک روپیہ کیوں لیا۔ اور نہ اس میں پوچھنے کی جرأت تھی۔ منشی جی نے سوچا۔ کہ ایک روپیہ ہر ماہ جمع کرانے سے سال میں بارہ روپے ہوتے ہیں اور اس طریقہ سے دس سال میں ایک سو بیس روپے ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان کا خیال دس سال تک انتظار کرنے کا نہیں تھا۔ انہیں امید تھی کہ کہیں نہ کہیں سے وہ اتنی رقم بہت جلد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ دیوان غالب خرید سکیں کام کرنے میں وہ کسی سے کم ہوشیار نہ تھے۔ لیکن کچہری میں یہ طریقہ ہو گیا تھا کہ مہینہ بھر میں جتنی نقلیں لکھی جاتیں ان سب کی اجرت نقل نویسوں میں برابر تقسیم کر دی جاتی تھی۔ گویا منشی جی کو بیس روپے سے زیادہ کسی صورت میں نہ مل سکتے تھے

پھر نہ معلوم انہوں نے یہ امید کیونکر لگائی تھی کہ وہ عنقریب ایک سو بیس کی رقم حاصل کر سکیں گے۔

بارہ روپے سال اور اس پر زیادہ سے زیادہ دو چار آنے سود اور دیوان غالب کی قیمت ایک سو بیس روپے؟

اگر لوگوں کو معلوم ہو جاتا۔ کہ منشی جی کس پریشانی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ تو وہ یقیناً ان پر ہنستے لیکن منشی جی کسی سے بے تکلف نہ تھے۔ اس لئے کوئی ان کے دل کی بات نہ جان سکتا تھا۔

۳

ایک روز بہت دنوں کے بعد منشی جی نے لائبریری میں آ کر خود دیوان غالب کا مرقع نکلوایا اور اسے دیکھنے لگے۔ لائبریری میں کوئی نہ تھا۔ صرف منشی جی تھے اگر وہ دیوان کو اپنے ساتھ لے جاتے تو انہیں کوئی دیکھ نہ سکتا تھا گھبرائی ہوئی نظروں سے انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔ دیوان کو بند کیا۔ اٹھنا چاہا مگر ہمت نہ ہو سکی۔ ٹانگوں نے جواب دے دیا۔ دل میں ایک عجیب کشمکش جاری تھی۔ بارہ سال انتظار کرنے کی بجائے وہ آج ہی اپنی تمنا پوری کر سکتے تھے۔ تاہم خودداری مانع تھی۔

کشمکش ضرور ہو سکتی ہے مگر ضمیر جو عمر بھر ایک خاص طرز زندگی کا عادی رہا ہو یکدم نہیں بدل سکتا۔ منشی جی کئی دفعہ ارادہ کرنے کے باوجود دیوان اپنے ساتھ نہ لے جا سکے۔ ایک لمبا سانس لیا۔ دیوان واپس کیا اور شاید پندرہ برس بعد پہلی مرتبہ بغیر اخبار پڑھے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

باہر آ کر انہیں خیال آیا۔ کہ اگر وہ نظر بچا کر دیوان اپنے ساتھ لے بھی آتے تو بھی چوری چھپی نہ رہتی کیونکہ دیوان انہوں نے اپنے نام سے نکلوایا تھا۔

اس دن کے بعد انہوں نے پھر لائبریری کا رُخ نہ کیا۔ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ ان کا ارادہ اور بھی پختہ ہوگیا تھا

منشی جی اب پہلے سے بھی زیادہ خاموش رہنے لگے۔ شام کو گھر میں ہی لیٹے رہتے تھے۔ لیکن اب وہ اپنی بیوی اور بچوں کو ڈانٹتے نہ تھے۔ سخت سے سخت غلطی پر بھی خاموش رہتے تھے۔ اس تغیر نے سب کو پریشان کر دیا کیونکہ اس کی وجہ کوئی نہ سمجھ سکتا تھا۔ غصہ بہر حال اس بات کا ثبوت ہے کہ غصہ ہونیوالے میں ابھی زندہ رہنے کی خواہش باقی ہے۔ لیکن یہ خاموشی اور پژمردگی۔ کیا یہ زندگی سے بیزار ہونے کا ثبوت نہیں ہے؟

منشی جی ہر مہینے ایک روپیہ ڈاک خانہ میں جمع کرا دیا کرتے۔ ایک سال گذر چکا تھا۔ اور بارہ روپے جمع ہوگئے تھے۔ مگر ابھی منزل بہت دور تھی۔

منشی جی کو اب بھی خیال تھا۔ کہ انہیں کہیں نہ کہیں سے رقم ضرور ملے گی چنانچہ وہ ہر اجنبی کو غور سے دیکھا کرتے۔ کہ شاید یہ میرے لئے کہیں سے دیوان کی قیمت لایا ہو۔

ڈاکیہ جب خط دینے آتا تو منشی جی خود جاکر اس سے خط لیتے۔ ممکن ہے وہ خیال کرتے ہوں کہ کوئی منی آرڈر آیا ہوگا مگر ہر دفعہ انہیں مایوس ہونا پڑتا۔ اور ہر دفعہ امید دوبارہ پیدا ہوتی تھی۔

امید اور یاس کی کشمکش میں بہت سے دن کٹ گئے۔ متفکر اور رنجیدہ رہنے سے منشی جی کی بیوی نے خط لکھ کر اپنے چھوٹے بھائی کو بلا لیا یہ شخص ایک زندہ دل نوجوان تھا۔ تعلیم اچھی پائی تھی۔ اپنا کاروبار کرتا اور معقول آمدنی رکھتا تھا۔ اس نے کھلے دل سے پیسہ خرچ کیا۔ اور منشی جی کا علاج کیا۔ مگر برسوں کی تھکن ایک دن میں نہیں اترتی۔ طبیعت مردہ ہو چکی تھی۔ زندگی کی طرف مائل نہ تھی

منشی جی لوگوں کی کوششوں کے باوجود زندگی کی آخری منزل سے قریب ہو گئے
بیماری جہاں جسمانی کمزوریوں کا باعث ہوتی ہے۔ وہاں ارادہ کو بھی کمزور کر دیتی ہے۔ اور ارادہ چونکہ کسی امید کی بنا پر قائم ہوتا ہے۔ اس لئے امید کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

جس شخص کے دل میں صرف ایک امید اور ایک ہی ارادہ ہو اور اس کی زندگی اس ارادہ کو پورا کرنے کے لئے وقف ہو چکی ہو۔ وہ یقیناً امید ٹوٹ جانے پر زندگی سے بیزار ہو جائے گا

اسی طرح منشی جی زندگی سے بیزار ہو چکے تھے۔ وہ جانتے تھے۔ کہ اب وہ دیوان غالب کو حاصل نہ کر سکیں گے۔ ان کی کل پونجی بارہ روپے تھی۔ اور دیوان غالب کی قیمت ایک سو بیس روپے ایسی حالت میں رشتہ داروں کی تمام کوششیں بے کار تھیں۔ ہاں اگر وہ منشی جی کے دل کی حالت کو جان لیتے تو شاید ان کی تدابیر کارگر ہو جاتیں۔

لیکن منشی جی کے دل کا داغ۔ داغ محبت کی طرح تھا۔ کہ عیاں ہونے پر بھی نہاں تھا۔ زندگی کی آخری گھڑیاں آگئی تھیں۔ وہ وقت قریب تھا جب مٹ مٹنے والے ارمان بھی مٹنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور اس پر بھی ہزار ہا مایوسیوں کے باوجود دل کی تڑپ کم نہیں ہونے پاتی۔

قانون قدرت ہے کہ جب انسان اپنی محبوب چیزوں سے بچھڑنے لگتا ہے تو اس وقت ان چیزوں کی محبت دل پر پوری طرح چھا جاتی ہے جب ناکامی کا یقین ہو جاتا ہے۔ تو آرزوؤں کا طوفان اور بھی امنڈتا ہے دل کہ ایک قطرہ خون ہے اپنے اندر اضطراب۔ بے چینی اور احساسات کی ایک دنیا پاتا ہے جس کی طوفانی کیفیت پر دنیا کی کوئی چیز قابو نہیں پا سکتی۔ ہاں، مگر یہ طوفان کا آخری جوش

ہوتا ہے۔ جس کے بعد بے حسی اور افسردگی کا دور آتا ہے

دیوان غالب محض ایک کتاب تھی۔ اس میں چند اشعار تھے اور اس میں چند رنگین تصاویر اور اس کی خاطر ایک صبر کرنے والے دل کا خون ہو رہا تھا۔ اور اس کی وجہ مفلسی تھی۔

۴

منشی جی کو یقین ہو گیا۔ کہ اب وہ زندہ نہ رہیں گے انہوں نے چاہا کہ اپنے دل کا حال لوگوں کو بتا دیں۔ بیوی سے کہہ نہ سکتے تھے۔ کیونکہ وہ شاید اس خواہش کو حماقت تصور کرتی۔ منشی جی کے لئے اس خواہش کا پورا ہونا معراج زندگی کے ہم معنی تھا۔ اس چیز کو اگر کوئی سمجھ سکتا تھا۔ تو وہی جس نے غالب کے اشعار سے محبت کی ہو۔

گھر میں ایک ہی مرد تھا۔ منشی جی نے اسے اپنے پاس بلایا۔ اور اس سے اپنے دل کی کیفیت بیان کی۔ اور اس خواہش کا ذکر کیا۔ جسے پورا کرنا ان کی زندگی کا مقصد بن چکا تھا۔ اور جس کے پورا نہ ہونے سے ان کی زندگی بے مقصد اور بے نتیجہ ہو کر ختم ہو رہی تھی۔ منشی جی کا مخاطب نوجوان تھا۔ اور وہ شاید کسی سے محبت کرتا تھا۔ کیونکہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور وہ بیقرار ہو گیا۔

"دولہا بھائی" اس نے کہا۔ "میں آپ کے جذبات کی بلندی کو نہیں پا سکتا لیکن وہ چیز جو ان کا مرکز ہے لا کے مہیا کر سکتا ہوں"

منشی جی کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو گئی" کیا تم وہ دیوان مرقع چغتائی لا سکتے ہو؟"

"ہاں دولہا بھائی" یہ کہہ کر وہ نوجوان گیا اور مرقع چغتائی خرید لایا۔ وہی خوبصورت جلد تھی اور اس پر جلی قلم سے لکھا تھا "دیوان غالب

کا یا تصویر مرقع"

"ہاں یہ وہی ہے" انہوں نے مرقع کو اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں لے لیا۔ اور اسے سینے پر رکھ لیا۔ ان پر ایک خوشگوار مدہوشی اور بے خودی طاری ہوگئی دو مدت کے بچھڑے ہوئے محبوب آپس میں ملتے ہیں۔ تو ان کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ یکا یک منشی جی کو کچھ خیال آیا۔ آنکھیں کھولے بغیر منشی جی نے پوچھا "اس کی کیا قیمت ہے؟

"بارہ روپے"

منشی جی نے جوش میں آکر مرقع کو پھینک دیا۔

"لے جاؤ۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ بارہ روپے تو میرے پاس بھی تھے۔ دیوان غالب کی قیمت ایک سو بیس روپے ہے"

"دولہا بھائی یہ وہی ہے"

منشی جی نے کچھ جواب نہ دیا۔

بارہ روپے! بارہ روپے! اور ایک سو بیس روپے! یہ نہ نہیں ہو سکتا تھا۔ آخری دفعہ امید بندھی اور پھر ٹوٹ گئی۔

اتنے نشیب و فراز کے بعد آخر زندگی ناکام ہی ثابت ہوئی۔ اور منشی جی بغیر خواہش کے پورا ہوئے اُس دُنیا میں چلے گئے۔ جہاں خواہشات کی پیدائش نہیں ہوتی۔

اب اگر ایک سو بیس روپے میں یہ مرقع خرید کر ان کے ساتھ دفن کر دیا جائے۔ تو بھی کیا ہوتا ہے؟

پھر پوچھا جائے گا کہ ان کے دل میں ایسی خواہش پیدا کیوں ہوئی۔ تو اس کا جواب کوئی نہیں۔ ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اگر بیماری سے پہلے منشی جی

جان لیتے کہ دیوان غالب کا مرقع اب صرف بارہ روپے میں مل جاتا ہے تو انہیں مایوس اور ناکام نہ رہنا پڑتا۔

لیکن پھر منشی جی کی زندگی ایک افسانہ کیونکر بنتی؟

(ترجمہ) (میر خلیل الرحمٰن)

تیاگ

۱

طلوعِ صباح کی ضیائے اولین کے ساتھ ساتھ زاہد اپنے غار سے نکلا۔ اور ایک چشمہ پہ جو دامنِ صحرا میں جاری تھا گیا۔ پھر اپنا بھاری لبادہ اتار کر ٹھیک اس وقت جبکہ آخری تارے مرجھا رہے تھے۔ اس نے سیاہ پانی میں غوطہ لگایا۔ سنگریزے تیز تھے۔ اور اس کے پاؤں کو زخمی کر رہے تھے۔ پانی جو برف کی طرح سرد تھا۔ اس کے جسم کو ایذا پہنچا رہا تھا۔ لیکن اس کی زبان سے کوئی حرفِ شکایت نہ نکلا۔ وہ خاموش ایک بت کی طرح کھڑا رہا۔ اس حال میں کہ اس کی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ اسی طرح وہ ساحل پہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اور جبکہ نسیمِ صبح اس کے جسم کی نمی کو جذب کر رہی تھی۔ اس کے بدن پر ذرا کپکپی نہ پیدا ہوئی۔

یہ ہو گیا۔ اور زاہد نے اپنا لبادہ پہنا پھر وہ اپنے غار میں، جا کر زانو کے بل عبادات و دعائیں مصروف ہو گیا۔ اب آفتاب بلند ہو گیا تھا۔ اور نیلگوں کہر سے ڈھکی ہوئی سطحِ صحرا سے بلند اس عظیم الشان دیوارِ کوہ پر اپنا زریں عکس ڈال رہا تھا۔ جہاں زاہد کا تنگ و تاریک غار ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابابیل کا آشیانہ کسی ریتلے ٹیلے کے پہلو میں۔ اب بھی سویرا ہی تھا۔ لیکن دنیا

بیدار ہو چکی تھی۔ لوے ترانہ ہائے مسرت گا رہے تھے۔ چڑیاں گھاس اور تنکوں کی تلاش میں اپنا گھونسلا بنانے کی غرض سے ادھر ادھر پھر رہی تھیں شہد کی مکھیاں شہد کی متلاشی تھیں۔ وادی سے جہاں لکڑہارے دن بھر کام کیا کرتے ہیں تیشوں کی ضرب کی آواز آرہی تھی۔ الغرض دنیا کے سارے کام شروع ہو گئے تھے۔

لیکن زاہد نے ان باتوں کا کچھ خیال نہ کیا۔ جب اس نے اپنے غار کے ریتلے فرش کو جھاڑ لیا۔ اور چشمہ سے اپنا گھڑا بھر لیا اس کا کام ختم ہو گیا۔ اس کے بعد شاید وہ اپنے تیز کیلوں والے بستر پر لیٹ کر اپنے داغدار جسم پر خار دار تانہ یانہ لگا کر کراہتا۔ لیکن چونکہ وہ کل ہی یہ سب کچھ کر چکا تھا۔ اس لئے ضرورت سے زیادہ تعزیر نفس کو ناجائز خیال کر کے وہ اپنے غار کے دروازہ کے قریب ایک مختصر سے چبوترہ پر بیٹھ گیا۔ اور اپنے لاغر ہاتھوں کو سمیٹ کر جنگل کے سر سبز و شاداب عجائبات کو دیکھنے لگا۔ آفتاب پورا اس کے چہرہ پر اس کی دھنسی ہوئی مجنونانہ آنکھوں اور ان شکنوں کو نمایاں کرتا ہوا جو خلوت کی زندگی نے اس جوان کے چہرہ پر ڈال دی تھیں چمک رہا تھا۔

وہ دیر تک کوشش کرتا رہا کہ اپنے نفس کو متشرع باتوں کے خیال پر مجتمع کرے لیکن اس کے خیالات مضطرب تھے۔ اس کے کان لوے کے بلند ترانوں کو سن رہے تھے۔ اور اس کی آنکھیں چڑیوں اور شہد کی مکھیوں کی مصروف زندگی کو دیکھتی تھیں۔ جبکہ وہ ایک پھول سے دوسرے پھول تک آجاتی تھیں اور خود پھولوں کی شیرینی کو دیکھ رہی تھیں

زاہد نے ان چیزوں پر اظہار تاسف کیا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ تمام اشیاء علم سے بے بہرہ اور روح سے بے گانہ ہیں نہ ان میں خدا کا علم ہے نہ وہ خدا کی عبادت کر سکتی ہیں۔ اس نے جنگل کے طیور و وحوش و حشرات الارض کی زندگی کا

کا مقابلہ اپنی زاہدانہ متفکر زندگی سے کیا۔ اور سمجھا کہ صرف اس کی روح خدا رسیدہ ہے۔
اس لئے ان خیالات سے کچھ اپنی تسلی کی۔ خدا اس کو بہت دُور معلوم ہوتا تھا۔

۲

ساری گرم صبح زاہد خاموش و سنجیدہ اپنا کثیف اور موٹا لبادہ پہنے غار کے
دروازہ پر بیٹھا رہا۔ ناگہاں قریب دوپہر کے اس کے کانوں میں گانے اور کسی ساز
کے بجنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد فوراً ہی ایک صورت اس مختصر چبوترہ پر نمودار ہوئی
وہ ایک نوجوان شخص کی صورت تھی۔ جو سر سے پاؤں تک ایک نیلگوں لباس میں
ملبوس تھا۔ اس کے گلے سے ایک مکمل شیریں موسیقی پیدا ہو رہی تھی۔ اور اس کی
آنکھیں مسرت سے چمک رہی تھیں

زاہد نے سرد مہری سے سلام کیا۔ اور جوان نے بھی گانا بند کر کے مسکراتے ہوئے
جواب دیا

"تم کون ہو؟" جوان نے پوچھا

"خدا کا ایک ادنےٰ بندہ"

"ہم سب ایسے ہی ہیں یا کم از کم ایسا ہی ہونا چاہیئے"

زاہد کے چہرہ پر سختی کا سا انداز پیدا ہو گیا "کیا تم بھی ہو؟" اس نے پوچھا

"ہاں میں ایسا ہی خیال کرتا ہوں۔ میں شاعر بھی ہوں"

"یہ افسوسناک بات ہے"

"کیوں؟" نوجوان نے ذرا برہم ہو کر پوچھا

"ایک شاعر موجودات عالم کا تصور ضرورت سے زیادہ تصنع کے ساتھ کرتا
ہے"

"دنیا بہت حسین ہے" جوان نے کہا

"لیکن وہ مکر و فریب سے بھی معمور ہے"

"دنیا کو خدا نے ہی بنایا ہے"

"لیکن انسان نے اسے بگاڑ رکھا ہے اور اس میں برائیاں پیدا کر دی ہیں"

"بے شک یہ صحیح ہے۔ معاصی فنا کئے جا سکتے ہیں اور یہی انسان کا بڑا اہم فرض ہے"

"تم اس کام میں کتنی مدد کرتے ہو؟"

"شاید بہت تھوڑی مدد لیکن اپنے امکان بھر میں اپنی چاروں طرف نگاہ ڈالتا ہوں اور دنیا اور اس کی تمام حسین چیزوں کو دیکھتا ہوں میں مسرور ہوتا ہوں۔ اور اپنی مسرت کو گاتا ہوں۔ میں لوگوں سے حسن کا ذکر کرتا ہوں میں یہ بھی اعتماد کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ میرے گیت دوسروں کو بھی مسرور کرتے ہیں"

"گیت تو دنیاوی چیز ہے"

"میں دنیا کو نہیں ٹھکراتا میں تو انسان اور وحوش و طیور سے متنفر نہیں ہوں یہ سب عالم حیات میں ہیں"

"تم شعر بھی کہتے ہو؟"

"ہاں یہ میرا پیشہ ہے میں زمین پر چلتا ہوں اور ان سب چیزوں کا گیت گاتا ہوں۔ جو میری نظر سے گذرتی ہیں۔ وہ مسرت ہو یا غم، نیکی ہو یا بدی۔ اور اگر مجھے کہنے کی اجازت ملے تو کہہ سکتا ہوں کہ تکلیف میں مبتلا ہونے والوں کی مدد بھی کرتا ہوں جناب میں انسان ہوں اور شاعر بھی"

زاہد نے کہا "اے میرے بچے مجھے اندیشہ ہے کہ دنیا تمہاری نگاہوں کو خیرہ کر رہی ہے دولت کے مناظر تمہیں مبہوت بنائے ہوئے ہیں شہروں کا زرق برق ہونا اور خواہشات نفسانی کی مسرتیں تمہاری روح کو برباد کئے دیتی ہیں"

شاعر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میں اپنے خیال میں تو ویسی ہی زندگی بسر کرتا ہوں جو میرے نزدیک صحیح ہے۔"

"تم کبھی عبادت بھی کرتے ہو؟"

"اکثر۔ لیکن میری عبادت تو میرے گیت ہیں۔"

زاہد نے ذرا کبیدہ ہو کر پوچھا "یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ مسرت، نیکی اور سچائی کا گیت گانا۔ خدا اور اس کی صفتوں کا گیت گانا۔ مجھے اس سے زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ صرف اپنی روح کے لئے عبادت کیا کروں۔"

شاعر نے نرمی سے جواب دیا۔ اور کچھ سکوت کے بعد پوچھا "جناب کی زندگی کیا ہے؟"

زاہد نے کہا "میں اس غار میں رہتا ہوں اور مراقبہ۔ ریاضت۔ نفس کشی کیا کرتا ہوں۔ تاکہ میں اپنی خواہشات نفسانی کو مغلوب کر سکوں۔ اور روح کو قوی"

ناگہاں جوان ہنس پڑا اس نے اپنا سر بلند کیا۔ اس کے دانت نمایاں ہو گئے۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے کہا "اے میرے متبرک دوست تم سخت غلطی میں مبتلا ہو۔ تم بقید حیات ہو اور پھر بھی حیات کا حال کچھ نہیں جانتے تم کو حسن و محبت و ہمدردی کا ذرا علم نہیں ہے تم نے اس مقصد کو نظر انداز کر دیا جس کے لئے انسان پیدا ہوا ہے اور وہ صرف سعی و عمل ہے ناکامیاب ہونا اس سے بہتر ہے کہ سرے سے کوشش ہی نہ کی جائے اپنے چاروں طرف دیکھو۔ تمام اشیاء حرکت کر رہی ہیں۔ چڑیاں اپنے گھونسلے بنا رہی ہیں۔ پھول اگ رہے ہیں۔ اور اپنی دولتیں ہمیں سونپ رہے ہیں ہوائیں چلتی ہیں صدہا جہازوں کو لئے ہوئے بہ رہے ہیں۔ سمندر متحرک ہے۔"

زاہد نے کہا "میں تو نجات کی تلاش کر رہا ہوں۔"

"میرا خیال ہے یہ سب چیزیں اسی تلاش میں ہیں"

شاعر نے یہ کہا۔ اور اپنا رباب اٹھایا جس کو زمین پر ڈال دیا"۔

"کیا تم جا رہے ہو؟"

"ہاں میرا تمہارا کوئی میل نہیں یہاں میرا ٹھیرنا بیکار ہے"

"میں تمہیں کچھ کھلانا چاہتا ہوں۔۔۔ شہر۔"

"تم دوسروں کے حاصلِ محنت سے فائدہ اٹھاتے ہو"

"خود اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی روٹی"

"کس نے بویا؟ کس نے کاٹا؟ کس نے غلّہ کو پیسا؟ کیا تم نے؟"

"چشمہ کا پانی سہی"

"چشمہ بھی وہ بہ رہا ہے اس میں تمہارا کیا احسان؟"

شاعر نے ایک ٹھنڈا سانس بھر کر کہا "معاف کیجئے گا میں نے اس وقت وعظ و پند سے کام لیا۔ اور اپنی حد سے بڑھ گیا شاعر کا فرض وعظ و نصیحت نہیں اس کا کام صرف آگاہ کر دینا ہے۔ ہم اپنے تئیں منزل انسانیت میں میل راہ کہتے ہیں۔ اور ہم غالباً اس سے حقیر بھی نہیں ہیں۔ اچھا اب میں خیرباد کہتا ہوں"

اس نے منہ موڑا اور ناہموار راستہ پر پھر گاتا ہوا چل دیا

۳

عرصہ تک زاہد بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کی نگاہیں سوچ کی وجہ سے ایک جگہ پر قائم تھیں اس کا دل ملول تھا۔ اور اس کو وہی شکوک تکلیف پہنچا رہے تھے۔ جو برسوں پہلے اس خلوت کدہ میں آنے سے قبل اس کو ستایا کرتے تھے۔

"کیا یہ صحیح ہے۔ کہ میں مشکلات اور دنیا کی ترغیبات سے بھاگ آیا ہوں؟ کیا یہ صحیح ہے کہ میں نے ہنگامہ عمل سے منہ موڑ لیا ہے؟ اس نے اپنی اس مجاہدانہ زندگی کو سودمند یقین کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بیکار۔ اس نے اپنی ریاضتوں، عبادتوں، نفس کشی کا خیال کیا۔ اس نے اپنے کانٹوں والے بستر اور خاردار تازیانہ کو دیکھا لیکن نوجوان شاعر کے الفاظ اب تک اس کے دماغ میں گونج رہے تھے۔

"ناکامیاب ہونا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ سرے سے کوشش ہی نہ کی جائے"

شام ہوئی جنگل نے پھر اپنا دھندلا نقاب چہرہ پر ڈال لیا۔ آفتاب ڈوب گیا۔ چڑیوں نے اپنا نغمہ ہم آہنگی کے ساتھ شروع کیا چشمہ نے اپنی دھیمی آواز کو بلند کیا۔ پھول سونے کے لئے جھک گئے۔ گویا وہ مطمئن تھے کہ انہوں نے گزرنے والے دن کی شان و شوکت میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور کیا ہے

رات آگئی

آخرکار زاہد اٹھا۔ اور اپنے ہاتھ متبسم ستاروں کی طرف اٹھائے ہوئے کھڑا ہو گیا

اب اسکی دعائیں ایک عجیب و غریب جوش تھا اور اسکی روح ایک غیر معمولی درد سے لبریز تھی۔

وہ فوراً غار کے اندر گیا۔ اور کونہ سے اپنا خاک آلودہ بوسیدہ عصا اٹھایا جس کے سہارے سے وہ برسوں پہلے یہاں آیا تھا۔

اس کو مضبوط پکڑ کر وہ جنگل کی تاریکی میں غائب ہو گیں۔

ساری رات وہ چلتا رہا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غیر مرئی ہاتھ اسکو آگے بڑھا رہا ہے اور صبح کے وقت اس نے ایک شہر کے دروازہ کو کھٹکھٹایا۔

(نیاز فتحپوری)

(ترجمان)

دیوتا کا انتقام

۱

کوہ ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی جو سطح زمین سے انتیس ہزار فٹ بلند ہے دھوپ میں صاف نظر آرہی تھی۔ اس کے آس پاس کی چوٹیاں برف پوش تھیں لیکن کیلاش پر سر سبز دوب اگی ہوئی تھی اور جگہ جگہ گرم ملک کے میووں کے درخت کھڑے تھے۔ جا بجا جنگلی پھولوں کے خودرو پودے بھی اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ لیکن طیور خوش الحان کا کہیں نام بھی نہ تھا۔ بجائے نوکیلے ہونے کے اس کی سطح ہموار تھی۔ اور ایک گوشہ میں پھوس کی ایک کٹی بنی ہوئی تھی

کٹی سے کچھ ہٹ کر جانب مشرق ایک مرد بزرگ جن کے نورانی چہرہ پر جلال برس رہا تھا۔ ہرن کی کھال پر پالتی مارے تسبیح خوانی میں مصروف تھے گورا رنگ، کشادہ پیشانی، بیضوی چہرہ، سیاہ مونچھ ڈاڑھی اور کالی کالی جٹا نے ان کے چہرہ کو بارعب بنا رکھا تھا۔ ان کے سر کی سیاہ جٹا سے ایک عورت کا دلکش چہرہ عجب انداز سے اپنے لب لعلیں سے پانی کی دھار پھینک رہا تھا۔ پانی اچھلتا کودتا ہزاروں فٹ کی بلندی سے زمین پر گر رہا تھا یہی وہ گنگا تھی جس کا منبع آج تک کسی کو دریافت نہ ہو سکا۔ اور یہ مرد بزرگ کیلاش کے رہنے والے مہا دیو جی تھے۔

بڑی دیر تک عبادت کرنے کے بعد مہادیو جی نے آنکھیں کھولیں اور انگڑائی لیکر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے گردن میں لپٹے ہوئے کالے سانپ نے بھی اپنا پھن نکالا۔ یہ کٹی کی جانب بڑھے تھے۔ کہ اس میں سے ایک پری جمال نازنین جس کا گول چہرہ غزالی آنکھیں، گندمی رنگ، نیلے ہونٹ، حسن مجسم کی شبیہ پیش کر رہے تھے باہر نکلی، اس حورِ وش مہ جبین کے چہرہ پر اداسی کی جھلک نمایاں تھی۔

مہادیو جی نے محبت سے سوال کیا "پیاری پاربتی آج تم کچھ اداس نظر آرہی ہو؟"

پاربتی نے شرم سے گردن جھکا کر جواب دیا "مہاراج آج میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے اس کی وجہ سے طبیعت پریشان ہے"

مہادیو جی نے مضطربانہ پوچھا "وہ کونسا خواب ہے جو پاربتی کو پژمردہ کر سکتا ہے؟ اندر چل کر اپنا خواب بیان کرو۔ میں اس کی تعبیر بتلاؤں گا"

جب یہ لوگ اندر مرگ چھالوں پر بیٹھ گئے۔ تو پاربتی جی نے کہا "سوامی خواب میں مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں بے کنٹھ میں اڑ رہی ہوں ذرا دیر کے بعد جب میں زمین کی طرف آنے لگی۔ اور کچھ ہی دور گئی ہوں گی کہ ایک چٹان پر مجھے کوئی سفید چیز چمکتی ہوئی نظر آئی۔ میں وہیں اتر پڑی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ وہ کپڑے کی جھولداریاں تھیں اور ان کے سامنے کئی گورے رنگ کے آدمی بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں ان کی گفتگو اس چوٹی پر چڑھنے کے متعلق تھی۔ ذرا دیر بعد میری آنکھ کھل گئی اس وقت سے مجھے یہ فکر دامن گیر ہے۔ کہ جس جگہ ہم مدتوں سے رہتے چلے آئے ہیں وہاں اگر یہ لوگ پہنچ گئے تو ہم کہاں رہیں گے؟"

مہادیو جی تشفی آمیز لہجہ میں بولے "تم اس کی کچھ فکر نہ کرو۔ ابتدائے آفرینش سے ہم یہیں قیام پذیر ہیں اور مہاپرلے تک یہیں رہیں گے یہ چوٹی ہمیشہ پدیول

سے اونچی ہے اور یہاں تک پہنچنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ جن کو تم نے دیکھا وہ یورپینوں کا ایک گروہ ہے۔ جو اس چوٹی پر چڑھنے کے لئے آیا ہے مجھے معلوم ہے۔ کہ وہ تیئیس ہزار فٹ چڑھ آئے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کا یہاں تک پہنچنا محال ہے"

پاربتی جی سادگی سے بولیں "مہاراج ان کے چہروں سے استقلال ٹپک رہا تھا اور وہ آپس میں کہہ رہے تھے۔ کہ ہم دو روز میں چوٹی پر ہوں گے"

مہادیو جی نے تعجب انگیز مسکراہٹ سے کہا "کچھ حرج نہیں ان کو کوشش کرنے دو۔ وہ یہاں تک پہنچنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ میں اگر چاہوں تو ایک لمحہ میں ان کی شمع حیات گل کر دوں مگر چاہتا ہوں کہ وہ از خود تھک کر واپس جائیں۔ پاربتی کیا تم کو یاد ہے کہ دو سال پہلے بھی تم نے ایسا ہی خواب دیکھا تھا؟"

پاربتی نے سر ہلا کر جواب دیا "ہاں سوامی اب تک وہ خواب مجھے یاد ہے"

مہادیو نے تسلی دیتے ہوئے کہا "اس وقت بھی تم غمگین ہو گئی تھیں حالانکہ میں نے تب بھی یہی کہا تھا۔ کیا تم نے مجھے کبھی جھوٹ بولتے پایا ہے؟"

پاربتی جی عقیدت مندانہ لہجہ میں بولیں "نہیں مہاراج یہ کام تو انسانوں کا ہے۔ کہیں دیوتا بھی جھوٹ بولتے ہیں؟"

مہادیو جی نے متانت سے فرمایا "پاربتی تم دیکھو گی کہ یہ لوگ اس سال بھی ناکام واپس جائیں گے۔ اس متبرک چوٹی پر ابھی تک انسانی قدم نہیں آسکتے اور جب تک ہم میں قوت ہے ان کے قدم یہاں تک نہیں آنے پائیں گے"

آخری بات انہوں نے سختی سے کہی۔ اور ان کی پیشانی پر شکن ہو گئی

۲

ٹلّہ کوہ سے چھ ہزار فٹ نیچے دو چھوٹی چھولداریاں استادہ تھیں ان کے سامنے چار آدمی بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد دو نے اٹھ کر قلیوں کو جو تھوڑی دور بیٹھے تھے۔ تیار ہونے کا حکم دیا۔ ذرا دیر میں آٹھ توانا قلی اپنے اپنے ہلکے بوجھوں کو اٹھا کر تیار ہو گئے۔ یہ جگہ سطح زمین سے تیئیس ہزار فٹ کی بلندی پر تھی۔ یہ لوگ اس جماعت کے تھے جو کوہ ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی کیلاش پر پہنچنے کے لیے یورپ سے آئی تھی۔ حالانکہ یہ لوگ گرم کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ جو خاص طور سے پہاڑ کی سردی سے بچنے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ پھر بھی ہوا اس قدر سرد تھی کہ ان کے کپڑوں سے گذر کر ہڈیوں کو ٹھنڈک پہنچا رہی تھی۔

دو آدمیوں نے معہ قلیوں کے چڑھائی شروع کر دی ہوا کی تیزی ہر لحظہ بڑھتی جاتی تھی۔ پھر بھی یہ لوگ ہانپتے کانپتے چڑھے ہی چلے جاتے تھے کبھی چٹان پر پیر پڑتا کبھی برف پر۔ مگر ہر ایک کا قدم مضبوطی سے پڑتا تھا آہستہ آہستہ چڑھتے ہوئے یہ لوگ سہ پہر کے وقت پچیس ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ گئے۔ لیکن آخر ہمت انسانی نے جواب دے دیا۔ اور یہ سستانے کی غرض سے بیٹھ گئے۔

ان میں سے ایک نے ہانپتے ہوئے کہا "میلوری یہ چڑھائی تو واقعی بڑی مشکل ہے اور پھر ہوا ایسی تیز ہے کہ قدم جمنے نہیں دیتی"

میلوری نے دم لے کر کہا "ہاں بلندی اور ہوا کی تیزی کے باعث ہماری رفتار اس قدر سست ہے بہرحال اگر کہو تو یہیں کہیں چھولداریاں نصب کر دیں"

بروس نے کہا "نہیں ابھی اور اوپر چلو یہ جگہ اچھی نہیں ہے پڑاؤ مشرق کی طرف ڈالنا چاہیئے۔ تاکہ مغربی ہوا سے محفوظ رہیں"

میلوری نے اوپر کی طرف دیکھ کر کہا "بروس یہ قلی بہت تھک گئے ہیں پہاڑ کی چڑھائی تو یوں بھی دشوار ہوتی ہے پھر بوجھ لے کر چڑھنا تو اور بھی قیامت ہے"

بروس نے سگرٹ سلگاتے ہوئے کہا "اچھا اب چلو ابھی چھولداری نصب کرنے میں بڑی دیر لگے گی"

میلوری اٹھ کھڑا ہوا اور یہ دونوں آگے بڑھنے والے تھے کہ ایک قلی ان کے پاس آکر بولا "ہم میں سے چار تو اس قدر تھک گئے ہیں۔ کہ بوجھ لے کر کسی طرح بھی نہیں چل سکتے۔ اگر آپ یہیں قیام کرتے تو اچھا تھا"

بروس کہنے لگا "یہاں ٹھہرنے کی جگہ اچھی نہیں۔ جو قلی نہیں چل سکتے۔ وہ یہیں ٹھیریں۔ ہم لوگ کیمپ کے لئے جگہ تجویز کر کے ان کی مدد کو واپس آجائیں گے"

یہ کہہ کر انہوں نے چڑھائی شروع کی یہ لوگ کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ ان کو پتھر کے سہارے کھڑی ایک چھولداری ملی اس کو دیکھ کر میلوری بول اٹھا "بروس دیکھو ۱۹۲۳ء میں ہم لوگ یہاں تک پہنچے تھے لیکن ہوا نے آگے بڑھنے نہ دیا"

لیکن بروس نے اطمینان سے جواب دیا "اس سال ضرور کامیابی کا سہرا ہمارے سر رہے گا"

یہ گفتگو کرتے ہوئے یہ لوگ اوپر چڑھ رہے تھے تھوڑی دور ان کو مشرق کی جانب کچھ ہموار زمین ملی۔ یہ جگہ کیمپ قائم کرنے کے لئے موزوں سمجھی گئی۔ قلیوں نے بوجھ رکھدئے اور میلوری ان کو کھولنے میں مشغول ہوا۔

بروس ایک قلی کو لے کر نیچے اترا۔ اور دو مرتبہ میں اسباب اور خستہ قلیوں کو وہاں لے آیا۔ قلیوں نے زمین صاف کی اور ذرا دیر میں وہاں دو چھولداریاں نصب ہو گئیں۔ صرف تین قلی دوسرے دن کی چڑھائی کے لئے روک لئے گئے اور باقی نیچے اترنے لگے۔

قلیوں کے جانے کے بعد بروس بھی میلوری کے پاس آکر بیٹھ گیا اور تکلیف کے لہجہ میں کہنے لگا" میلوری میرے سینہ میں سخت درد ہو رہا ہے"

میلوری نے دلجوئی کرتے ہوئے کہا" ہاں تم دو مرتبہ بوجھ لے کر چڑھے ہو۔ اسی وجہ سے تمہارے سینہ میں درد ہو رہا ہے صبح جاتا رہے گا"

"ہاں یہی وجہ معلوم ہوتی ہے اچھا چلو آرام کریں کیونکہ صبح جلد تیار رہو جانا چاہیئے"

میلوری بولا" ہاں کل ہم کو کیمپ نمبر ۵ قائم کرنا ہے اس کے بعد پرسوں اس وقت دنیا کے بلند ترین پہاڑ کی چوٹی ہمارے قدموں کے نیچے ہو گی"

بروس نے ہنس کر کہا" ہاں کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم کیوں نہ کیلاش پہ پہنچ جائیں"

۳

صبح نہایت خوشگوار تھی۔ افق مشرق میں سرخی پھیل رہی تھی۔ کہ میلوری اور بروس دونوں کپڑے پہن کر چھولداری سے باہر نکل آئے لیکن ایک قلی کے سوا تمام قلیوں نے ہمتیں ہار دیں۔ قلیوں کے بغیر اوپر کیمپ کا سامان کیسے جاتا؟ آخر بادل ناخواستہ یہ دونوں بھی معہ تین قلیوں کے نیچے اتر آئے۔ اتار بمقابلہ چڑھاؤ زیادہ آسان تھا یہ لوگ نصف مسافت طے کر چکے تھے کہ نارٹن اور سومرویل بھی پیچھے سے آتے ہوئے ملے

ان کے پاس پہنچ کر نارٹن نے حیرت سے پوچھا "برومس ہم تو سمجھتے تھے کہ تم لوگ آج چھٹے کیمپ پر ہو گے اتر کیوں رہے ہو؟"

برومس نے غمگین آواز میں جواب دیا "ان قلیوں کی ہمت تو کل کے طوفان نے سلب کر لی تھی۔ صرف ایک قلی چلنے کو تیار ہوا۔ اس لئے مجبوراً لوٹ آئے۔"

سومرول تشفی آمیز لہجہ میں بولا "فی الواقعہ یہ مجبوری بُری تھی۔ اب ہم لوگ قسمت آزمانے جا رہے ہیں۔ کامیابی خدا کے ساتھ ہے۔"

میلوری نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "آمین۔ اچھا اب دیر نہ کرو اوپر سب سامان ٹھیک سے ملے گا ہم لوگ کیمپ نمبر ۴ کے لئے سامان اوپر چھوڑ آئے ہیں۔ کیونکہ ہمیں معلوم تھا۔ کہ آج تم لوگ اوپر چڑھو گے۔"

نارٹن اور سومرول استقلال سے قدم بڑھاتے ہوئے اسی راستہ سے اوپر چڑھنے لگے جس سے ابھی برومس میلوری اور ان کے بار بردار نیچے اترے تھے۔ ہوا آج تیز نہ تھی۔ اس لئے چڑھائی کل کی بہ نسبت آسان تھی اور یہ لوگ بخیریت کیمپ نمبر ۵ میں شام کے قریب پہنچ گئے۔ انہوں نے اوپر سامان لے جانے کے لئے چار قلیوں کو روک لیا باقی قلی نیچے اتر آئے۔

صبح صادق کا ظہور ہوتے ہی دونوں اوپر چڑھنے کے لئے پھر تیار ہو گئے کافی پیتے ہوئے سومرول نے کہا "نارٹن آج تو کیمپ نمبر ۶ قائم ہو جائے گا۔ کیونکہ تین قلی چلنے کو تیار ہیں"

قہوہ کا خالی پیالہ رکھ کر نارٹن بولا "سومرول یہ خوش نصیبی ہے کہ قلیوں نے دھوکا نہیں دیا۔ اب تو چلنا چاہیئے۔ وہ دیکھو قلی بھی بستر، کھانے کا سامان اور چھولداری لئے تیار کھڑے ہیں"

دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور چڑھائی شروع کر دی۔ لیکن اب چڑھائی دشوار ہو گئی تھی۔ ذرا دور چل کر پھر انہیں دم لینے کو رکنا پڑتا۔ گھنٹوں کی مشقت کے بعد یہ لوگ چھبیس ہزار سات سو فٹ بلندی پر پہنچے اب ان میں آگے بڑھنے کی طاقت تھی۔ اور نہ قلیوں میں ہمت یہ لوگ یہیں رک کر سستانے لگے۔ حسن اتفاق سے یہ جگہ کیمپ قائم کرنے کے لئے نہایت موزوں تھی۔ یہاں کی چٹانیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ کسی وقت میں یہاں جھرنے کا سوتہ تھا۔ جو اب خشک ہو کر ایک گڑھا سا بن گیا تھا۔ یہ جگہ ہوا سے بھی محفوظ تھی۔ قلیوں نے اسباب اتارا۔ اور چٹانوں کے سہارے آٹھ پونڈ وزنی ایک چھوٹی سی چھولداری نصب کر دی۔ پھر زمین ہموار کی گئی اس کے بعد تینوں قلی نیچے بھیج دیئے گئے۔

قلیوں کے چلے جانے پر سومردل قہوہ بنانے میں مصروف ہو گیا۔ صبح جلد روانہ ہونے کے خیال سے انہوں نے تھوڑا قہوہ تھرماس میں بھر لیا۔

۴

جب یہ لوگ سو کر اٹھے تو ان کو تھرماس کی ڈاٹ کھلی ہوئی ملی اور اس میں قہوہ کا نام و نشان نہ تھا۔ اب قہوہ بنانے کا وقت نہ تھا۔ آخر برف پگھلا کر خوب پی۔ کیونکہ اتنی بلندی پر پیاس بہت پریشان کرتی ہے اور اس سے فارغ ہو کر چڑھائی شروع کر دی گئی۔

ان کے داہنی جانب پہاڑ پر دھوپ پھیلی ہوئی تھی یہ لوگ ہانپتے کانپتے بدقت دھوپ میں پہنچے تمازت آفتاب نے ان کے بدن میں حرارت پہنچائی اور دونوں خوش خوش اوپر چڑھنے لگے تھوڑی دور ان کو ایک قسم کی زرد چٹان ملی۔ جس کو ہوا اور بارش نے بہت چوڑا کر دیا تھا۔ اور یہ زینہ کا کام دیتی تھی

جوں جوں اوپر چڑھتے گئے۔ ان کو سانس لینے میں دقت ہونے لگی۔ کچھ دیر کے بعد ہوا اس قدر پتلی ہو گئی کہ ان کو سانس لینے کے لئے قدم قدم پر رکنا پڑتا تھا اب ہر قدم پر آٹھ یا دس بار سانس لینے کی ضرورت پڑتی۔ ان کی رفتار بھی سست ہو گئی۔ ہر بیس پچیس قدم کی چڑھائی کے بعد ان کو ایک دو منٹ سستانے کے لئے رکنا پڑتا۔ تقریباً اٹھائیس ہزار فٹ پر سومردل کی ہمت نے جواب دیدیا۔

وہ تھکان سے چور ہو کر کہنے لگا "نارٹن اب مجھے ایک ایک قدم دوبھر ہو رہا ہے اس کے علاوہ میرے حلق میں بھی درد ہے اس لئے تم آگے بڑھو میں یہیں رکتا ہوں"

اور وہ دھوپ میں ایک کرارے پر بیٹھ گیا۔

کچھ جواب دیئے بغیر نارٹن اوپر چڑھنے لگا۔ یہ قت ایک گھنٹہ میں اس نے آٹھ فٹ طے کیا۔ لیکن تھکاوٹ سے چور ہو کر وہ بھی سومردل کے پاس لوٹ آیا۔

رومال سے پسینہ صاف کر کے نارٹن نے کہا "سومردل آگے بڑھنا غیر ممکن ہے۔ سانس لینے میں بڑی دقت ہوتی ہے اب بتاؤ کیا رائے ہے؟"

سومردل نے تکلیف سے جواب دیا "اوپر جانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو رسی میں باندھ لیں پھر شاید حفاظت سے پہنچ جائیں لیکن میرے حلق میں اس قدر درد ہے کہ سانس لینے میں تکلیف ہوتی ہے"

نارٹن نے خستگی سے کہا "دم تو مجھ میں بھی اب نہیں اس لئے چلو لوٹ چلیں۔ دیکھو یہاں سے منظر کتنا خوبصورت ہے وہ سامنے برف سے ڈھکی ہوئی پیو موری کی چوٹی ہے دنیا کے بڑے بڑے پہاڑ گیا چنگ اور

جو یہاں سے کم از کم ایک ہزار فٹ نیچے ہیں۔ ہمارے ہر چاروں طرف پہاڑوں کی سر بفلک چوٹیاں نظر آ رہی ہیں۔ لیکن یہاں سے وہ سب چھوٹی چھوٹی میخیں معلوم ہوتی ہیں۔

سومردل نے نیچے دیکھتے ہوئے کہا "ہم لوگ یہیں بھی تو اٹھائیس ہزار فٹ کی بلندی پر وہ سامنے تبت کا میدان نظر آ رہا ہے۔ یہ یہاں سے کم از کم دو سو میل دُور ہے۔ پھر بھی ہر چیز صاف نظر آتی ہے ہم لوگ اتنی بلندی سے دیوتاؤں کی طرح بیٹھے دنیا کو دیکھ رہے ہیں"

نارٹن ہنس پڑا۔ "دیوتا! اجی ہم اس وقت جانوروں سے بھی بد تر ہیں جانور آرام سے سانس تو لے سکتے ہیں۔ لیکن ہم کو سانس لینا بھی مشکل ہے اچھا اب نیچے اترو۔ یہاں کب تک بیٹھے رہو گے"

اتار بھی اتنا ہی خطرناک تھا۔ جتنا چڑھاؤ بدقت یہ لوگ اس کیمپ میں پہنچے۔ جہاں سے صبح کو شاداں و فرحاں اس غیر مفتوح چوٹی پر پہنچنے کی خوش کن امید پر روانہ ہوئے تھے۔ لیکن یہاں یہ زیادہ دیر نہ رکے اپنے اوڑھنے بچھانے کا سامان کمر پر لاد کر نیچے اترنے لگے۔ آفتاب نے آشیانہ مغرب میں بسیرا لے لیا۔ اور شب کی سیاہ چادر دنیا پر پھیل گئی۔ لیکن یہ اتنی ہمت اور مستقل ارادے کے لوگ تھے۔ کہ برابر اترتے ہی گئے۔ جب تاریکی زیادہ ہو گئی تو نارٹن نے بجلی کا جیبی لمپ روشن کر لیا۔ اور اس کی روشنی میں اتارا آسان ہو گیا۔ برقی لمپ کی روشنی جب نیچے والوں نے دیکھی تو ان کی مدد کو بڑھے۔

جب سومردل اور نارٹن کیمپ نمبر ۴ میں پہنچے۔ تو رات زیادہ ہو چکی تھی۔ یہ لوگ اس قدر خستہ ہو گئے تھے۔ کہ بستر پر دراز ہوتے ہی دین و دنیا کی خبر نہ رہی نیند نے ان کے ساتھ تریاق کا کام کیا۔ اور جب یہ سو کر اٹھے تو ان کی تکلیف میں گونہ

گو نہ کمی ہو گئی تھی۔

ان کی غیر حاضری میں میلوری اور اروِن نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر یہ دونوں چوٹی پر پہنچنے میں ناکامیاب رہے۔ تو آکسیجن بھری بوتلوں کی مدد سے ایک بار اور کوشش کی جائے۔ ممکن ہے عارضی ہوا کی مدد سے سانس لینے میں آسانی ہو۔

صبح ہوتے ہی یہ لوگ، آٹھ قلیوں پر اسباب لاد کر تیار ہو گئے۔

میلوری نے ہنس کر کہا "یہ آخری کوشش ہے دوستو! اگر پہنچ گئے تو خیر ورنہ یہ چوٹی انسانی قدموں سے ہمیشہ پاک رہے گی"

سومرول بولا "خدا حافظ ہے جاؤ خدا۔ اور یہ عارضی ہوا کی بوتل تمہاری مدد کرے"

دوسرے نے کہا "آمین!"

پھر سب سے ہاتھ ملا کر یہ دونوں نوجوان روانہ ہو گئے۔ اور دن رہے بخیریت کیمپ نمبر ۵ میں پہنچ گئے دوسرے روز چار بجے شام کو کیمپ نمبر ۶ پر جو ستائیس ہزار چھ سو فٹ کی بلندی پر واقع تھا۔ قیام کیا۔ اس کیمپ سے دوسرے روز قلہ کوہ تک پہنچنے کا ارادہ تھا

۵

صبح کی روشنی میں نیلگوں آسمان نہایت خوشنما معلوم ہوتا تھا ستاروں کی شمعیں جھلملا رہی تھیں۔ اور قندیل ماہتاب کی روشنی مدھم ہو چلی تھی اس وقت میلوری اور اروِن سو کر اٹھے۔

اروِن نے آسمان کو دیکھ کر کہا "لو آج بھی مطلع صاف ہے اور لطف یہ کہ طوفانی ہوا بھی نہیں آج بیڑہ پار لیں گے"

میلوری نے ہنس کر جواب دیا "ہاں یہ بات عجیب ہے کہ ہم کو برابر آسمان

صاف ملا - اور آفتاب چمکتا رہا - شروع میں البتہ مون سون کے آثار نظر آئے تھے - لیکن وہ بھی غائب ہو گئے :

چھولداری کی طرف مڑ کر مارڈن نے کہا "میلوری چلو تنزینگ کو چڑھائی شروع کر دیں ابھی بہت فاصلہ طے کرنا باقی ہے "

تنزینگ اور یہ دونوں توانا و تندرست نوجوان جنہوں نے ہفتوں سے نہ حجامت بنائی تھی نہ غسل کیا تھا - اور نہ کپڑے ہی صاف پہنے تھے - کمر ہمت باندھ کر چڑھنے لگے - یہ چڑھائی بہت مشکل تھی - جیسا کہ نارٹن اور سومرول کو اتفاق ہو چکا تھا کچھ دور پھر ان کو وہی سیڑھی نما زرد چٹانیں ملیں - اور ان پر وہ لوگ آہستہ آہستہ چڑھنے لگے - آکسیجن کی بوتلیں جیبوں میں اور ربڑ کی نالیاں ناک میں لگی ہوئی تھیں اس کے باعث سانس لینے میں آسانی ہو گئی تھی - اٹھائیس ہزار فٹ سے کچھ اونچے پہنچے پر یہ لوگ سستانے کو رکے -

گھڑی دیکھ کر مارڈن نے کہا " لو اب ایک ہزار فٹ سے کم رہ گیا ہم کو ساڑھے تین سو فٹ چڑھنے میں دو گھنٹے لگے - ایسا نہ ہو کہ چوٹی پر پہنچنے میں شام ہو جائے "

میلوری نے جواب دیا " چڑھائی بہت دشوار ہے اس سے ہم لوگوں کی رفتار اتنی سست ہے - اچھا آؤ کوشش کریں "

اور یہ لوگ دگنی تیزی سے چڑھنے لگے

بلندی کے ساتھ ساتھ ہوا بھی پتلی ہوتی گئی - عارضی ہوا کی بوتل ان کو سانس لینے میں بہت مدد دے رہی تھی - مگر چٹانیں اتنی چکنی تھیں کہ ان پر پاؤں جمانا مشکل تھا - دوپہر کے قریب یہ لوگ چوٹی سے تقریباً پانچ سو فٹ رہ گئے لیکن اب خرابی یہ لاحق ہوئی کہ جن زرد چٹانوں پر یہ زینہ کی طرح چل رہے تھے

ان کے درمیان فاصلہ زیادہ ہوگیا۔ بعض چٹانیں ڈھیلی بھی تھیں۔ جو ان کے بوجھ سے ہلنے لگتی تھیں۔ ارون آگے جا رہا تھا۔ اور رمیلو رپی پیچھے۔ یہ لوگ احتیاط سے قدم اٹھاتے چڑھ رہے تھے۔ تاکہ قدم نہ پھسلے اور کبھی کبھی سنبھلنے کے لئے اوپر والی چٹان کو پکڑ لیتے تھے۔

۲

چوٹی سے مہادیو جی پاربتی کے ساتھ ان کے چڑھنے کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ دیکھتے ہوئے پاربتی بولیں "مہاراج یہ بڑے نڈر ہیں دیکھئے تو کتنی دور آگئے۔ تین چار گھنٹے میں یہ لوگ چوٹی پر ہوں گے"

مہادیو جی نے تعریف کے لہجہ میں فرمایا "اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ بے خوفی سے چڑھ رہے ہیں۔ لیکن پاربتی اب چڑھائی خطرناک ہوگئی ہے ذرا پیر پھسلا تو بس کھڈ میں ہوں گے"

پاربتی جی نے سر اٹھا کر کہا "اتنے نیچے دیکھنے سے میری تو طبیعت گھبراتی ہے"

مہادیو جی نے سمجھایا "ہاں بلندی سے پستی کی جانب دیکھنے میں خوف ہی معلوم ہوتا ہے۔ چڑھنے والے کو چاہیئے کہ بغیر نیچے دیکھے چڑھے۔ یہ لوگ برابر چڑھے چلے آرہے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر روکے نہ گئے تو چوٹی پر پہنچ جائیں گے"

پاربتی نے ترس کھا کر کہا "سوامی یہ لوگ جان پر کھیل کر آئے ہیں اور بہت پیاسے ہیں۔ اس لئے اس طرح روکئے کہ ان کو کچھ گزند نہ پہنچے۔ آپ سب دیوتاؤں میں رحمدل مشہور ہیں"

مہادیو جی بولے "یہ سچ ہے پیاری پاربتی میں سب دیوتاؤں سے زیادہ رحمدل ہوں مگر اب یہ رحم کا کام نہیں میں نے ان کے راستے میں بہت سی دقتیں حائل

کیں تاکہ ان کو آگاہی ہو مگر یہ بیوقوفوں کی طرح خود اپنی موت کے منہ میں آرہے ہیں تم انہیں اپنی سزا پانے دو۔"

پاربتی نے سفارش کی "سوامی آخر انسان ہیں آپ ان کے قصور معاف بکمر دیں۔"

مہادیو نے چیں بجبیں ہو کر کہا "پاربتی اب یہ ناممکن ہے اب یہ ضرور رہ کے جائیں گے۔ تم اب کچھ نہ کہو۔"

دہ دیوتا جن کی نیک دلی اور رحم کی داستانیں ہندوؤں کی قدیم کتابوں میں مذکور ہیں اس وقت غیظ و غضب کی مجسم شبیہ تھا۔ اس نے اپنی شعلہ بار آنکھوں سے آسمان کی جانب دیکھا۔ دفعتاً آسمان پر کالے کالے بادل محیط ہونے لگے اور پہاڑی ہوا چلنی شروع ہو گئی۔

پاربتی نے نیچے دیکھا۔ تو وہ ان دونوں باہمت انسان اوپر والی چٹانوں کو مضبوطی سے پکڑے نیچے والی چٹانوں پر پیر جمائے نظر آئے

ہوا کا زور دم بدم بڑھتا جاتا تھا۔ آسمان کو ابر سیاہ نے ڈھک لیا۔ اور آفتاب کا رُخ روشن سیاہ طوفانی بادلوں میں اس طرح چھپ گیا۔ جیسے کسی حسینہ کا چہرہ پُر نور بلوری ہوئی زُلفوں میں

ہوا کا زور دیکھ کر میلوری بولا "اروِن خدا حافظ اگر تم نیچے بخیریت پہنچو تو کہہ دینا کہ میں آخر تک ثابت قدم رہا۔ اس طوفانی ہوا اور اس بے درجہ تاریکی کے باعث ان چٹانوں پر زیادہ دیر تک ٹھہرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔"

اروِن نے مایوس ہو کر کہا "اپنا بھی یہی حال ہے میلوری تم سے کچھ زیادہ اونچائی پر ہونے کے باعث مجھے زیادہ تکلیف ہو رہی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا ہم کو پہاڑ سے کھینچ کر نیچے گرا دے گی۔"

میلوری تکلیف سے گویا ہوا۔ میرے دونوں ہاتھ چٹان پکڑے پکڑے درد کرنے لگے ہیں۔ نسیں ڈوری کی طرح اُبھر آئی ہیں اور۔ ۔ ۔"

لیکن بے چارے کا جملہ ناتمام رہا۔ جس چٹان کو وہ پکڑے تھا وہ ہلی اور ہوا نے اس کو چٹان سمیت ہزاروں فٹ کی گہرائی میں گرا دیا۔ ایسی ہی چٹان پر ارون پیر جمائے تھا دفعتاً ایک دھکا لگا اور چٹان پیر کے نیچے سے نکل گئی اگر وہ اوپر والے کرارے کو مضبوطی سے نہ پکڑے ہوتا تو وہ بھی میلوری کے ساتھ ہی نیچے گر جاتا۔ لیکن اب وہ ہوا میں معلق تھا اس کے پیر جھول رہے تھے۔ اس نے اوپر اٹھنے کی بہت کوشش کی لیکن ہوا مانع تھی۔ اس کے ہاتھ شل ہو چکے تھے۔ وہ بے جان ہونے لگے اور ان میں چٹانوں کو زیادہ دیر تک پکڑنے کی طاقت نہ رہی۔

ہوا اب اسقدر تیز ہو گئی تھی۔ کہ معلوم ہوتا تھا گویا چوٹی کو جڑ سے اکھاڑ ڈالے گی۔ دفعتاً ارون کو ایک ایسا جھونکا لگا۔ کہ چٹان اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اور وہ اٹھائیس ہزار پانچ سو فٹ کی بلندی سے دامن کوہ میں ان سنگریزوں پر گرا۔ جن سے دریائے گنگا بل کھاتی ہوئی بہ رہی تھی اس کا جسم چکنا چُور ہو گیا۔ اور مُرغ روح فوراً قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ اس کے پاس ہی اسکے دوست میلوری کی لاش تھی۔ جو سنگریزوں پر گرنے کے باعث پاش پاش ہو گئی تھی۔

پاربتی جی یہ مہیب منظر دیکھ کر گھبرا گئیں منہ سے بے ساختہ نکل گیا "ارے یہ کیا ہوا" مہادیو جی نے غضب ناک آواز میں کہا "یہ کیلاش کے دیوتا کا انتقام ہے!"

اسکے بعد جلد ہی ہوا کا زور کم ہو گیا۔ اور بادلوں کی نقاب ہٹا کر آفتاب اپنا نورانی چہرہ دکھانے لگا لیکن اب ان باتوں سے لطف اٹھانے والا کون تھا؟

(جی۔ پی۔ بھٹناگر)

(زمانہ)

سچ اور جھوٹ

۱

حسن صورت بڑی قسمت سے ملتا ہے۔ اور اگر حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت بھی ہو تو کیا کہنا۔ لکشمی میں یہ دونوں خوبیاں بدرجہ اُتم موجود تھیں۔ قدرت نے اس دیوی کے سنوارنے میں اگرچہ بڑی فراخدلی سے کام لیا تھا۔ مگر دُنیا میں آکر یہ اُن دکھوں سے نہ بچ سکی جو پیدائش اور موت کے لوازم ہیں،

لکشمی کا باپ امرناتھ ایک مشہور تاجر تھا۔ ہر جگہ اُن کی عزت ہوتی تھی۔ دولت اس قدر تھی۔ کہ باوجود بے حد فضول خرچی کے لکشمی کے لئے اتنا روپیہ چھوڑ گئے تھے۔ جو اس کی تمام عمر کے گذارہ کے لئے کافی ووافی ہو امرناتھ بڑے حوصلہ کے آدمی تھے ان کے دوستوں کا دائرہ بہت وسیع تھا جلسوں اور دعوتوں میں ہزاروں روپے پانی کی طرح بہاتے تھے۔ رفاہ کے کاموں سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ اور تیرتھ جاترا میں ہر سال ایک معقول رقم مفت خوروں کی نذر کرنا فرض اول خیال کرتے تھے۔ بات یہ ہے اکیلے آدمی تھے۔ متعلقین کے نام سے کوئی قریبی رشتہ دار بھی نہ تھا۔ سمجھتے تھے کہ گھر میں لے دے کے صرف ایک بیوی ہے سوا اس کے کھانے کے لئے بہت بچ رہے گا۔ ہم آئے دُنیا میں آکر کچھ نام کر جائیں

ان باتوں سے ناظرین کہیں یہ نہ سمجھیں کہ تاجر صاحب اولاد کی طرف سے لاپرواہ تھے۔ نہیں ایسا نہ تھا۔ اپنے بھر بڑی کوشش کر چکے تھے مگر بد قسمتی نے لاکھوں روپیوں کا ستیاناس کر دیا۔ آخر مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔ اور اس وقت سے روپیہ اور بھی پانی کی طرح بہنے لگا۔ آخر کئی برسوں کے بعد پنڈتوں کے پوجا پاٹ نے اگر پورا نہیں تو کچھ اثر ضرور دکھلایا۔ دوسری طرف سے پیروں اور شہیدوں کی ارواح نے بھی کچھ سہارا دیا۔ امرناتھ کے گھر ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر پچاس سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ تاجر صاحب اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر روپیہ کو دنیا کی کل نعمتوں پر ترجیح دیتے تھے اسی وجہ سے لڑکی کا نام لکشمی رکھا۔ اس موقعہ پر جو خوشیاں منائی گئیں ان کا اعادہ کرنے کے بجائے فقط اندازہ کر لینا زیادہ اچھا ہوگا۔

مگر دنیا میں شادی و غم توام ہیں امرناتھ کو یہ بات سخت قلق کے ساتھ ماننی پڑی۔ لڑکی ایک سال کی بھی نہ ہونے پائی تھی۔ کہ ان کی اہلیہ مرگ ناگہانی کا شکار ہو گئی بے چارے کرتے کیا۔ کسی طرح صبر کیا۔ اور لڑکی کے ساتھ طبیعت بہلانے لگے۔ جس میں ان کو رفتہ رفتہ کامیابی ہوتی گئی۔

لکشمی دوج کے چاند کی طرح بڑھی۔ دن گذرتے دیر نہیں لگتی حتےٰ کہ اس سن کو پہنچ گئی۔ جس کے آگے لڑکی کا بن بیاہا رکھنا امرناتھ کے عقیدہ کے مطابق مہاپاپ تھا۔ یعنی لڑکی کی عمر اب سات سال کے قریب تھی باپ کو شادی کی سخت فکر ہوئی۔ اس کم بخت رسم کی تقلید میں تو وہ پکے لکیر کے فقیر تھے۔ مگر تعجب ہے کہ اس وقت ان کو ایک نئی بات بھی سوجھی تاجر صاحب کنیا کے لئے بر ایسا تلاش کرتے تھے جس کی خاندانی قدامت کو کم از کم ضرور امر مسلمہ ہو صحت جسمانی بھی اچھی ہو۔ باقی اور کوئی بات قابل لحاظ نہیں اگر کسی غریب کا

لڑکا ہو تو بہت اچھا جو والدین زندہ نہ ہوں تو اور بھی قابل پسند یہ تجویز نرالی تھی۔ مگر امرناتھ دنیا کے اسٹیج پر کوئی نیا ایکٹر تو تھا نہیں اس میں کچھ نہ کچھ مصلحت پوشیدہ تھی۔ یا تو یہ بات تھی کہ اس مثال سے قوم میں ایک زبردست اصلاح کی تحریک کی جائے۔ یا دنیاوی معاملات پر غور کرتے ہوئے یہ زیادہ انسب معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس طریقہ سے شادی کے بعد لڑکا اپنی سسرال ہی کا ہو رہے اور لکشمی کے باپ کا عصائے پیری بنے جوئندہ یابندہ۔ امرناتھ کی ان تھک کوششوں نے چند مہینوں کے اندر اپنی حسب خواہش بر تلاش کر لیا۔ جس کا دنیا میں کوئی یار و مددگار نہ تھا ہاں یا تو ایشور تھا۔ یا وہ دس پانچ اشخاص جن کی مجموعی شفقت اس غریب کی پرورش اور تعلیم کی کفیل تھی۔ اجیت سنگھ کی عمر دس سال سے زیادہ نہ تھی۔ صورت شکل سے ہونہار معلوم ہوتا تھا۔ امرناتھ کی نگاہ انتخاب جو اس پر پڑی تو پھر آگے نہ بڑھ سکی۔ آخر بڑی دھوم دھام کے ساتھ بیاہ ہو گیا۔ لکشمی بے چاری یہ بھی نہ سمجھی کہ یہ کیا ہوا ہے اور کس لئے ہوا۔

لیکن امرناتھ کے نصیبوں میں سکھ نہ تھا۔ اجیت سنگھ کو سسرال میں رہتے مشکل سے ایک سال گذرا تھا کہ ایک روز وہ دفعتاً غائب ہو گیا جستجو شروع ہوئی ادھر ادھر آدمی دوڑے اشتہار دیئے گئے۔ مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ اب امرناتھ کی آنکھوں میں زمانہ اندھیر ہو گیا۔ دنیا بگڑی تو عاقبت کی فکر ہوئی۔ تجارتی کاروبار آہستہ آہستہ بند کر دیا۔ وقت کا زیادہ حصہ مالا جپنے میں بسر ہونے لگا۔

تیرہ برس اور گذر گئے۔ بڈھے امرناتھ کو مرے ہوئے دو سال ہو چکے ہیں اب لکشمی تنہا گھر میں رہتی ہے اور ایک پرانی خادمہ اس کی رفیق ہے لکشمی کا ظاہر و باطن یکساں دلفریب تھا۔ اجڑے ہوئے باغ میں گلاب کا ایک خوشنما

پھول کھلا ہؤا جس کی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

اب یہ کوئی معصوم بچہ تو تھی نہیں۔اپنی دردناک حالت کو بخوبی محسوس کر سکتی تھی۔شوہر کی مفقود الخبری۔باپ کی مفارقت دائمی، نہ کوئی عزیز نہ رشتہ دار بے چاری کو زندگی وبال ہونے لگی۔ مگر خوش نصیبی سے تھی پڑھی جب طبیعت زیادہ گھبراتی تو اس کے لئے کتابوں کا مطالعہ تسکین بخش ثابت ہوتا تھا اور وہ پرماتما کو دھنیہ باد دیتی تھی۔کہ ودیا کی بدولت اس کے دل کو ایسے بھاری دُکھ میں کچھ شانتی حاصل ہو جاتی ہے

۲

اوپر کے واقعہ کو گذرے ہوئے کئی سال ہو گئے۔اور اب قصہ کا تسلسل ہم کو مجبوراً دوسری طرف متوجہ کرتا ہے

شام کا وقت ہے طوفانی ہوائیں بڑے زور شور سے چل رہی ہیں سمندر کی سطح جو ذرا دیر پہلے کسی ریگستانی میدان کی طرح ہموار تھی اب کوہستان کا ایک نامتناہی سلسلہ بنی ہوئی تھی رعد کی مہیب آوازیں ان بے چارے تارکانِ وطن کا کلیجہ ہلائے دیتی ہیں۔جو ایک چھوٹے سے جہاز پر سوار ہو کر جزائر فیجی سے ہندوستان کو واپس آرہے ہیں۔قدرت اس سے بڑی خوفناک روش سے کھیل رہی ہے جہاز فٹ بال کی طرح ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا ہے۔کبھی پانی پر ہے کبھی آسمان پر۔ ہر جہازران اس بلائے ناگہانی سے نجات پانے کیلئے اپنی اپنی جگہ بڑی مستعدی سے کام کر رہا ہے

جان بڑی پیاری ہوتی ہے غریب مسافر بھی اس وقت جہازرانوں کی مدد پر تلے ہوئے ہیں۔خاص کر ایک ۲۸ ، ۳۰ برس کا جوان بڑی جرأت اور استقلال کے ساتھ فرض انسانی کے ادا کرنے میں مصروف ہے اور جہاز کے

کپتان کے ساتھ اس مقام پر جا پہنچتا ہے جہاں ہدائت یا حمائیت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے،

مگر کیا انسان کی بساط اور کیا اس کی کوشش! آثار اچھے نہیں نظر آتے۔ جہاز قابو سے باہر ہے آنے والی تباہی اس پر اپنا نقشہ عجلت کے ساتھ جما رہی ہے سب کو یہی اندیشہ ہے کہ جہاز کسی بحری چٹان سے اب ٹکرایا اور اب ٹکرایا۔

جہاز کی حالت دم بدم بگڑتی گئی۔ خطرہ زیادہ بڑھتا گیا۔ بالآخر کشتیاں کھول دی گئیں۔ اور مسافر اپنا مال و اسباب جہاز پر چھوڑ کر کسی طرح ان پر سوار ہو سکے مگر آخری شخص نے تختہ پر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک عورت چلا اٹھی "ہائے میرا بچہ جہاز پر رہ گیا" اس دردناک آواز نے رحم دل مسافر کو بے تاب کر دیا۔ بچہ کو ڈھونڈنے کے لیے یہ الٹے پاؤں اوپر چڑھ گیا۔ ادھر کشتیاں اچھلتی کودتی روانہ ہو گئیں ہوا اور پانی کی مجموعی طاقت کے مقابلہ میں یہ ہلکی پھلکی کشتیاں کب ٹھیر سکتی تھیں

صبح ہو گئی نہ تو جہاز کا پتہ ہے نہ کوئی کشتی نظر آتی ہے البتہ ایک بڑا مستول سطح آب پر آہستہ آہستہ بہتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس سے کوئی شخص لپٹا ہوا ہے اس وقت ہوا میں گو نہ سکون ہے امواج کا تلاطم مفقود ہو گیا ہے آسمان صاف ہے سورج کی ہلکی ہلکی کرنیں اس مصیبت زدہ کے چہرہ پر پڑ رہی ہیں۔ بالکل بے حس و حرکت ہے۔ یہ شخص یا تو بے ہوش ہے یا مر گیا ہے ذرا غور سے دیکھو آہ یہ تو وہی بندہ خدا ہے جو کل شام کے طوفان میں بد نصیب جہاز والوں کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ تصویر میں دو رُخ ہوا کرتے ہیں۔ مگر زندگی کی تصویر میں کتنے رُخ ہوتے ہیں۔ اس کا شمار کوئی نہیں کر سکتا۔

آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ مستول برابر بہ رہا ہے۔ نعش بدستور لپٹی ہوئی ہے سامنے سے ایک بڑا جہاز اس طرف آ رہا ہے۔ اب یہ مستول کے قریب پہنچ گیا

جہاز والوں نے دیکھا تو ایک کشتی چھوڑی گئی۔ اور ذرا دیر میں مستول سے لپٹا ہوا نوجوان جہاز پر لایا گیا۔ ڈاکٹر صاحب آئے دیکھا بھالا۔ یہ شخص صرف بے ہوش تھا جان ابھی باقی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کے موافق مریض کو جہاز کے ایک چھوٹے کمرہ میں باآرام لٹا دیا گیا۔ جہاں اس کا علاج شروع ہوا۔

دوائیں اپنی تاثیر دکھلائے بغیر نہ رہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد مریض نے آنکھ کھولی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص ابھی کوئی خواب دیکھ رہا تھا جس سے یکا یک بیدار ہو گیا ہے۔ کیونکہ پہلا جملہ جو اس کی زبان سے نکلا یہ تھا۔ "آہ معصوم بچے! میں بڑی خوشی سے اس وقت مرجاتا۔ اگر مجھ کو اس بات کا اطمینان ہوتا۔ کہ تو صحیح وسالم بچ گیا" اس کے بعد دیوانہ وار ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر نے فوراً کوئی اور دوا پلائی کہ طبیعت کو تسکین ہو۔ کچھ دنوں میں جہاز بمبئی پہنچ گیا۔ مریض کی صحت ابھی درست نہ تھی۔ چنانچہ یہاں بھی اس کے ساتھ وہی ہمدردانہ سلوک روا رکھا گیا۔ جو جہاز پر ہوتا آیا تھا۔ جس کا وہ ہر صورت مستحق تھا۔ سرگذشت کیا تھی درد، ہمت جرأت، اور ایثار کی سچی کہانی تھی۔ ایک مرتبہ تو پتھر کا دل بھی پسیج جاتا تھا۔

۴

اندھیری رات ہے ساون بھادوں کی راتیں اندھیری ہوا کرتی ہیں بالاخانہ کے ایک کمرہ میں لکشمی بیٹھی ہوئی ہے۔ کمرہ بڑی نفاست اور سادگی کے ساتھ آراستہ کیا گیا ہے سامنے میز پر ایک لمپ جل رہا ہے۔ وہیں کچھ کتابیں قرینہ سے چنی ہوئی ہیں۔ دیوار سے ایک کلاک لگا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب نو بج گئے۔ کمرہ میں چاروں طرف دریچے ہیں۔ جو اس وقت کھلے ہوئے ہیں۔ لکشمی میز کے پاس ایک کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب دیکھ رہی ہے خادمہ ابھی نہیں آئی نیچے کام میں مشغول ہے

لکشمی کی عمر اب چھبیس سال کی ہے۔ مگر انقضائے مدت کا بجز اس کے اور کوئی نمایاں اثر نہیں کہ یہ اب پیشتر کے بہ نسبت گورنہ نحیف وزار دکھائی دیتی ہے۔ اور گھر کے کل حالات بدستور سابق ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے کتاب بند کر دی اور پھر اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی سے ایک خوبصورت انگشتری اتار دی جس میں ایک معمول سے زیادہ بڑا نگینہ جڑا ہوا تھا۔ اس کی طرف بڑی دیر تک حسرت و یاس کی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ اس اثنا میں انگوٹھی کئی مرتبہ انگلی میں پہنی گئی اور کئی مرتبہ اتاری گئی انگشتری کیا تھی۔ کوئی داستان شوق تھی۔ جس کے مطالعہ سے دل کو سیری نہ ہوتی تھی۔

گھڑی نے دس بجا دیئے۔ لکشمی کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے انگوٹھی ہاتھ میں پہنی اور آہ سرد بھر کر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پاس ہی ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ اس پر لیٹ گئی۔ کہ سو کر اپنے غم کو محو کر دے۔ مگر خیالات پریشاں کے ہاتھوں چین کہاں۔ کروٹوں پر کروٹیں بدلی گئیں۔ مگر نیند کے نام سے پلک تک نہ جھپکی۔ آخر کچھ خیال آیا۔ اٹھی اور دریچہ کے پاس جا کھڑی ہوئی آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے روشنی کے نام سے نہ چاند تھا نہ کوئی ستارہ۔ ہر طرف بالکل اندھیرا تھا۔ البتہ اس تاریکی میں بھولی بھٹکی نگاہ کے لئے اگر کوئی رہنما تھا۔ تو وہ صرف بجلی کی عارضی چمک تھی۔ کچھ کچھ بوندیں بھی پڑتی تھیں۔ یہ وقت بڑا خوش کن تھا۔ مگر کن کے لئے، عشاق کامگار کے لئے۔ ہجراں نصیب لکشمی کے لئے نہیں۔ یہاں تو یہ سماں دکھ کو اور بھی بڑھا رہا تھا۔ دل تھا کہ گہوارہ انتشار۔ ایک خیال جاتا تھا ایک آتا تھا۔ مگر جہاں تک جسم سے تعلق تھا۔ اس اضطراب کا کوئی اثر ظاہر نہ تھا۔

بت کی طرح چپ چاپ کھڑی تھی۔ بڈھی خادمہ کمرہ میں داخل ہوئی مگر اس کو آہٹ تک نہ ملی

بڑھیا کی آنکھیں کچھ تو قدرتاً کمزور واقع ہوئی تھیں۔ کچھ سن کا بھی اقتضا تھا۔ قریب قریب اندھی ہو چکی تھی۔ جب لکشمی کو پلنگ پر نہ پایا تو حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ آخر کچھ جھلک پا کر یوں بولی

بڑھیا: "بیٹی ابھی تک نہیں سوئیں وہاں کھڑی کیا کرتی ہو؟"

لکشمی۔ (چونک کر) "کچھ نہیں یوں ہی کچھ طبیعت گھبرائی سو دریچہ کے پاس ذرا کھڑی ہو گئی۔ یہاں ہوا اچھی آتی ہے"

بڑھیا: "تو لاؤ پلنگ اسی طرف لگا دوں"

لکشمی: "نہیں کوئی خاص ضرورت نہیں میں اب آتی ہوں تم بھی اپنا بستر لگا لو پھر سو رہیں"

بڑھیا۔ اچھا کہہ کر اپنا بستر اٹھا لائی جھاڑنے لگی تو کوئی چیز کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ نکل کر الگ زمین پر جا پڑی۔ یہ ایک بڑا لفافہ تھا۔

بڑھیا کو معاً یاد آگیا۔ چونک کر بولی "بیٹی لکشمی ادھر تو آؤ۔ یہ لفافہ فرش سے اٹھا لو۔ مجھے کاہے کو ملنے لگا۔ کم بخت آنکھیں تو کسی کام کی نہیں"

لکشمی۔ (دوڑ کر لفافہ اٹھاتے ہوئے) "یہ کب آیا؟"

بڑھیا: "بیٹی معاف کرنا یہ آیا تو سویرے ہی تھا۔ مگر اس وقت تم پڑوس میں گئی تھیں۔ میں نے اس کو بستر میں رکھ دیا تھا۔ دگر پھر بھول گئی۔ یہ بڑھاپا کیا آیا۔ بڑا عذاب آیا۔ ہوش و حواس ٹھکانے ہی نہیں رہتے"

لکشمی۔ (لیمپ کے پاس لفافہ کھولتے ہوئے) "اچھا تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ مل تو گیا۔ چند گھنٹوں کے بعد سہی"

دنیا میں لکشمی کے پاس اگر کوئی خط بھیجنے والا تھا۔ تو صرف ایک شخص پھر بھی لفافہ کھولتے وقت ہاتھ کانپ رہے تھے۔ چہرہ پر ایک رنگ آیا ایک چلا گیا۔ بارے لفافہ کھلا۔ خط نکلا۔ اور یاس و امید کے مخمصوں کا خاتمہ ہو گیا۔ لکشمی خوش ہو گئی۔ دل ہی دل میں یوں پڑھنے لگی:۔

پیاری لکشمی چھ سات مہینے گذرے ہو گئے کہ میں نے تمہارے پاس ایک انگوٹھی بھیجی تھی۔ جو تم کو ملی ہو گی۔ ایک چٹھی بھی روانہ کی تھی۔ جو تمہارے پاس پہنچ گئی ہو گی۔ تم نے جواب بھی ضرور بھیجا ہو گا۔ مگر میری بدنصیبی تھی کہ مجھ کو نہ مل سکا۔ میں نے اپنی اس چٹھی میں یہ بھی لکھا تھا۔ کہ میں جلد آؤں گا مگر سوچو کچھ اور ہوتا۔ کچھ اور ہے۔ مجھ سے تو وقت مقررہ پر روانہ ہوا لیکن قسمت میں پریشان ہونا لکھا تھا۔ راستہ میں طوفان آیا۔ جہاز تباہ ہو گیا۔ مال و اسباب سمندر کی نذر ہوا۔ مگر غالباً تم کو دیکھنا بدا تھا کسی طرح بچ گیا۔ اب تین مہینے سے بمبئی میں پڑا ہوں بہت بیمار رہا۔ موت آتے آتے رہ گئی۔ اب بالکل اچھا ہوں گو گذری باتوں کا غم نہ کرنا

میں نے دو تین خط تمہارے والد کے نام مجھ سے بھیجے تھے ممکن ہے کہ وہ تمہارے یہاں نہ پہنچے ہوں یا ممکن ہے کہ خدا نخواستہ کوئی زندہ ہی نہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی وجہ سے جواب ہی میرے پاس نہ پہنچا ہو۔ خیر کچھ بھی ہو بہر حال میرے نہ آنے کی یہ ایک بڑی وجہ تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر میں تمہارے یہاں گیا بھی اور مکان خالی ملا۔ تو سوائے اس کے کہ میرے شکستہ دل پر ایک اور چوٹ لگے۔ اور کچھ حاصل نہ ہو گا اسی حیص بیص میں کچھ دن اور گذر گئے۔ بالآخر میں نے ایک انگشتری تمہارے پاس بھیجی۔ اس وقت میں نے اپنے دل میں یہ بات ٹھان لی تھی کہ جو کچھ ہونا ہو گا وہ ہو گا

مگر ایک بار تو جنم بھومی کے درشن کروں - اسی ارادہ سے روانہ ہو گیا - مگر راستہ میں افتاد پڑی - خیر اس کو خوش قسمتی سمجھو یا بد قسمتی جیتا بچ گیا - آج اماوس ہے غالباً پورنماشی کو تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا مجھ کو تمہاری زندگی میں اب بھی شک ہے - ایشور کرے کہ یہ شک محض شک ہی ثابت ہو - بالفرض اگر تم زندہ بھی ہوئیں تو مجھ کو یقین ہے کہ تم مجھے ہر گز نہ پہچان سکو گی - اور شاید میرے لئے بھی یہی مشکل درپیش ہو - خیر ان باتوں کا تصفیہ اسی وقت ہو جائے گا

تمہارا وفادار شوہر

اجیت سنگھ

نامہ شوق ختم ہو گیا - لکشمی نے اس کو پھر لفافہ میں رکھ دیا - اور پلنگ پر بیٹھ گئی - بڑھیا کی آنکھیں اسی طرف لگی ہوئی تھیں - جونہی لکشمی بیٹھی اس نے یوں خطاب کیا -

"کہو بیٹی کس کی چٹھی ہے ؟"

لکشمی - (شرمائی آواز میں) "بھلا میرے پاس خط اور کہاں سے آسکتا ہے تم خود ہی جان سکتی ہو"

بڑھیا - (بات سمجھ کر) "بیٹی اس وقت بڑا آنند ہوا - بھگوان خوش رکھیں اور لکھا کیا ہے ؟"

لکشمی "بمبئی سے خط آیا ہے پورن ماشی کے دن آنے کو لکھا ہے"

بڑھیا - (اور خوش ہو کر) "بھلا وہ دن بھی آئے کہ میں ان کو ان آنکھوں سے دیکھوں - بیٹی پرمیشر بڑا مالک ہے - انسان کو نراس نہ ہونا چاہیئے"

تھوڑی دیر کے بعد دونوں اپنی اپنی جگہ لیٹ گئیں - اور بڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں - آج لکشمی کا خواب بہت شیریں اور پر امید تھا

۴

مولراج کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جو کسی وقت اپنی عزت و شرافت میں مشہور تھا۔ مگر دنیا کبھی ایک حال میں نہیں رہتی۔ زمانہ میں ہمیشہ انقلاب ہوتا آیا ہے مولراج ایسا ننگ خاندان پیدا ہوا جس نے اس کی رہی سہی آبرو خاک میں ملا دی حنظل دیکھنے میں بہت خوشنما ہوتا ہے مگر ذائقہ میں نہایت بدمزہ۔ مولراج کا حسن ظاہری جس قدر دلفریب تھا اس کے خواص باطنی اسی قدر قابل نفرین تھے۔ جوا کھیلتا تھا۔ چوری کرتا تھا منشیات کا دلدادہ تھا، اور بد چلن تو پرلے درجہ کا تھا۔ غرض کہ دنیا میں کوئی ایسا عیب مشکل سے مل سکتا ہے جس کا خمیر ذات شریف کی جبلت میں نہ ہو جو کچھ بچی کچھی جائداد تھی۔ وہ سب انہیں عادات قبیحہ کے ہاتھوں ستیاناس ہو چکی تھی لیکن ان کو اس کی کیا پروا۔ اگر کسی وقت اپنے حال میں مست تھے تو اب اپنی کھال میں مست ہیں۔ دل میں شرافت کی بو بالکل باقی نہ تھی۔ البتہ اوپری سج دھج میں اس کا بدل ضرور موجود تھا۔ پڑھنے لکھنے کے نام سے بھی کچھ شُد بُد تھی۔ بیوی کڑھ کڑھ کر خدنگ اجل کا نشانہ بن چکی تھی۔ ان کو گھر سے تو کبھی دلبستگی نہ تھی اب رہا سہا سلسلہ بھی منقطع ہو چکا۔ بالکل آزاد تھے۔

بد قماش عموماً ہرزہ گرد ہوتے ہیں۔ مولراج اس صفت سے مستثنیٰ نہ تھا اب ان حضرت کا یہ مشغلہ تھا کہ سیر کرتے پھرتے تھے۔ قیام کا کچھ ٹھیک نہ تھا۔ اگر آج ایک جگہ ہیں۔ تو کل دوسری جگہ

آج سات آٹھ روز سے یہ اس گاؤں میں ٹھیرے ہیں۔ جہاں لکشمی کا مکان ہے۔ مادہ پرست انسان کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دینے کے لئے حسن عالمتاب کی ایک جھلک کافی ہوتی ہے مولراج دن رات اسی لٹوہ میں رہتا تھا۔ اتفاق سے ایک روز چلتے پھرتے لکشمی پر نگاہ پڑ گئی برسوں کی اوباشی سے طبیعت میں

بلا کا بے ساختہ پن آگیا تھا۔ بس صورت دیکھنے کی دیر تھی۔ کہ آپ بڑی سرگرمی سے اس کی محبت کا دم بھرنے لگے۔ ہر وقت اسی فکر میں غلطاں وپیچاں رہنے لگے۔ کہ کسی طرح وصال نصیب ہو۔ کئی مرتبہ کوچہ جاناں کی طرف گئے۔ نگاہ شوق بار بار اوپر کو اٹھی مگر بدقسمتی سے ہر مرتبہ مایوس ہو کر آئی۔

مولراج ناامید نہیں ہوا۔ معشوق کی پردہ داری نے جذبہ شوق کو اور بھی اکسایا جادہ عشق میں یہ کوئی نئے راہگیر تو تھے نہیں۔ مقصد براری کی ترکیبیں سوچنے لگے پرانے تجربہ نے قوت متخیلہ کو مدد دی۔ آخر انہوں نے طے کیا۔ کہ پہلے معشوق کے حالات سے واقفیت حاصل کرنی چاہیئے۔ مولراج ایسے چلتے ہوئے شخص کے لئے یہ کیا مشکل تھا۔ تھوڑی کوشش ضرور کرنی پڑی۔ مگر جلد ہی سب باتیں معلوم ہو گئیں۔

اب انہوں نے ایک نئی تدبیر سوچی دل میں ٹھان لی کہ کسی طرح ایک مرتبہ لکشمی سے ملنا چاہیئے۔ خواہ اس کام کے لئے اس کے مکان ہی میں کیوں نہ جانا پڑے۔ حضرت کو اپنے حسن خداداد پر کچھ کم غرور نہ تھا کامیابی کی خیالی تصویر ان کی آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی۔ جس کا ہر اشارہ امید افزا تھا۔

قبل کے باب میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کو گذرے ہوئے چھ سات روز ہو چکے ہیں رات کا وقت ہے آٹھ بجا چاہتے ہیں مولراج اپنی دھن میں مست لکشمی کے مکان کے پاس سڑک پر ٹہل رہا ہے آج اس کا مصمم ارادہ ہے کہ کسی سبیل سے اپنے دل وجان کی مالکہ کے درشن کرے۔ بارگاہ جاناں تک رسائی ہو جائے پھر آگے جو کچھ ہو۔ اس کا انحصار تو موقع ومحل پر ہے

بے شمار منصوبوں سے نجات ملتے ملتے کچھ وقت اور گذر گیا۔ آخر یہ مکان کے دروازہ کی طرف چلا آواز دینے ہی کو تھا کہ اس کو زمین پر کوئی سفید چیز دکھائی

دی۔ جو کچھ فاصلہ پر پڑی ہوئی تھی۔ خیال کا رُخ بدل گیا جا کر دیکھا تو ایک بڑا لفافہ تھا
جس کے اندر ایک خط ملا۔ مولراج نے سوچا کہ اس کو پڑھنا چاہیئے۔ شاید کوئی
بات اور معلوم ہو وہاں کھڑے ہو کر پڑھنا تو مناسب نہ تھا دروازہ سے پلٹنا پڑا
کچھ دُور جا کر یہ سڑک کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ چاند کا قدرتی لیمپ آسمان پر روشن
تھا۔ جس نے مولراج کی قوت بینائی کو کافی مدد پہنچائی اس نے خط کو بڑی دلچسپی
کے ساتھ پڑھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے دل میں ایک نیا خیال پیدا ہو گیا کچھ
دیر غور کیا اور یہ کہتے ہوئے کہ "ہاں بس یہی ٹھیک ہے" اپنی قیام گاہ کی جانب لوٹا۔
پرانے منصوبے سب ختم ہو چکے تھے ان کی جگہ نئی بندشوں نے لے لی تھی۔

۵

آج پورنماشی ہے ماہ تاباں آسمان کے نیلگوں فرش پر لوٹ لوٹ کر ہنس
رہا ہے۔ یا تو یہ اپنے کمال پر پہنچے ہوئے شباب کے نشہ میں متوالا ہے یا لکشمی
کو کسی آنے والی خوشی پر مبارک باد دینے کے لئے اظہار مسرت کر رہا ہے۔

ابھی بہت رات نہیں گذری لکشمی آج صبح سے اپنے پیارے شوہر کی راہ
دیکھ رہی ہے۔ مگر سلسلہ انتظار اب تک طول امل کی طرح بڑھتا ہی چلا جاتا
ہے۔ اب دل میں طرح طرح کے ولولے پیدا ہونے لگے ہیں۔ لیکن لکشمی کی قوت
برداشت بڑی زبردست ہے متواتر صدموں نے اس کو بے حد مضبوط بنا دیا ہی
طبیعت میں ایک اس قسم کا سکون پیدا ہو گیا ہے۔ جس کو ہم نہ خوشی کہہ سکتے ہیں
نہ غم۔ وہ جلد نا امید نہیں ہو سکتی۔ برابر اپنے شکوک رفع کرنے کی کوشش کرتی
ہے" پورنماشی کے ختم ہونے میں تو ابھی کئی گھنٹہ باقی ہیں آتے ہوں گے بالفرض
اگر آج نہ آئے تو کل آئیں گے۔ جس ایشور کی کرپا سے مجھ کو ان کی خبر ملی ہے وہی
ایشور مجھ کو ان کی صورت بھی دیکھنا نصیب کرے گا۔ اگر میرے جذبہ عشق میں اس

قدرکشش تھی۔ کہ ان کو ایک دور و دراز سرزمین سے اس ملک میں پھر کھینچ لائے۔ تو اب بمبئی سے یہاں تک لانے کے لئے اس میں کافی سے بھی زیادہ طاقت موجود ہے میں تراس کیوں ہوں۔ تراس ہونے کا موقع ہی کیا ہے"

للکشمی اس قسم کے خیالات سے اپنا جی بہلا رہی تھی کہ باہر کسی گاڑی کی گڑگھڑاہٹ سنائی دی۔ جو فوراً ہی بند ہو گئی۔ للکشمی کا دل دھڑکنے لگا۔ خوبصورت چہرہ پر خوشی کا رنگ ایک دم چڑھ گیا۔ آن کی آن میں ایک نکیلا بجیلا جوان مکان میں داخل ہوا۔ للکشمی استقبال کے لئے آگے بڑھی۔ فرط حیا سے آنکھیں چار نہ ہو سکیں آنے والے پر ایک شرمیلی نگاہ ڈالی اور جھٹ قدموں پر گر پڑی۔

آنیوالا" للکشمی یہاں ٹھیرنے کا موقع نہیں۔ جو کچھ بیش قیمت چیزیں ہوں وہ جھٹ پٹ لے لو۔ اور میرے ساتھ چلی چلو۔ اس وقت نہ مجھ کو زیادہ کہنے کی ضرورت ہے۔ نہ تم کو زیادہ سننے کی"

للکشمی یہ سن کر چونک پڑی دل میں ایک اور شک پیدا ہو گیا فوراً اٹھ کر الگ کھڑی ہو گئی اس نے خیال کیا کہ اس کو زیادہ سننے کی ضرورت تھی ضبط سے کام لیا استقلال کے ساتھ بولی "آپ کون ہیں؟"

آنیوالا۔ (ہنستے ہوئے) "آہ میرا قیاس صحیح نکلا۔ میں نے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ غالباً تم مجھ کو پہچان نہ سکو گی میں کون ہوں؟ اجیت سنگھ اور کون؟"

للکشمی کا ان الفاظ سے اطمینان نہ ہوا۔ اس نے آنے والے کی طرف غور سے دیکھا۔ اور پوچھا "مجھ کو کیسے یقین آئے؟"

آنیوالا" میں اس سے زیادہ تم کو اور کیا یقین دلا سکتا ہوں کہ میری انگوٹھی تمہاری انگلی میں موجود ہے بے شک میری تجویز سے تم کو حیرت ہوئی ہوگی۔ مگر میں امید کرتا ہوں کہ میں تم کو اس جلدی کا سبب بعد میں بتلا سکوں گا

یہاں سے چلیں تو سہی۔"
لکشمی کا شک ابھی رفع نہیں ہُوا۔ وہ کچھ کہنے ہی کو تھی۔ کہ ایک اور شخص مکان میں آتا ہوا دکھائی دیا۔ پہلے آنے والا شخص اس واقعہ سے کچھ گھبرا گیا۔ مگر اس نے ہمت سے کام لیا۔ نووارد کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا "آپ کون ہیں جو اس بے تکلفی سے اندر چلے آتے ہیں گویا یہ آپ ہی کا مکان ہے"

نووارد۔ (تعجب کے لہجہ میں) "کیا لکشمی کا مکان نہیں؟"

پہلا شخص۔ "تو پھر اس سے تم کو کیا مطلب؟"

نووارد: "اس سے میرا یہ مطلب ہے کہ میں لکشمی کا شوہر ہوں۔"

پہلا شخص۔ یہ خوب سوجھی مگر کچھ پروا نہیں لکشمی خود جانتی ہے کہ وہ کس کی بیوی ہے لیکن اب میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ مغالطہ آمیز اور فضول گفتگو کا وقت نہیں ہے یا تو صاف صاف اپنے آنے کا مطلب کہیئے یا فوراً تشریف لے جائیے۔ تاکہ مجھ کو کوئی دوسرا طریقہ اختیار نہ کرنا پڑے"

نووارد سمجھ گیا۔ کہ اس کو کیا کرنا چاہیئے۔ اس نے بڑی ضبط سے کام لیا اس کے لبوں پر ایک حقارت آمیز تبسم تھا۔ لکشمی کی طرف مخاطب ہو کر بولا "ذرا وہ انگوٹھی مجھ کو دے دو جو تمہاری انگلی میں ہے۔ بس یہی انگوٹھی ابھی سچ اور جھوٹ کو ظاہر کر دے گی"

بے چاری لکشمی حیرت کی تصویر بنی ہوئی کھڑی تھی پیر جہاں تھے وہیں جم گئے تھے۔ کبھی ایک کی طرف دیکھتی تھی اور کبھی دوسرے کی طرف۔ حیران تھی کہ یہ کیا معاملہ ہے

مگر پاکباز خواتین کے دل میں ایک قسم کی جرأت ہوتی ہے وہ جرأت اس دیوی کی مدد کے لئے حاضر تھی لکشمی نے یہ بات اپنے دل میں ٹھان لی تھی۔

کہ میں اس وقت تک کسی پر اعتبار نہ کروں گی جب تک کہ اعتبار کے کافی وجوہ ذہن نشین نہ کر دیئے جائیں۔

نووارد کی یہ بات سنتے ہی اس نے انگشتری اتار دی۔ اور اس کے حوالے کر دی اس شخص نے اس کو لے کر ادھر ادھر غور سے دیکھا۔ اور ایک طرف ذرا دبایا بڑا نگینہ فوراً کھل گیا اور اندر ایک چھوٹی سی تصویر دکھلائی دی۔

نووارد ۔ (لکشمی کو انگوٹھی واپس کرتے ہوئے) "بس دیکھ لو یہی تمہارا شوہر اجیت سنگھ ہے جس نے تم کو یہ انگشتری بھیجی تھی"۔

لکشمی نے بے صبری کے ساتھ انگشتری لے لی ایک مرتبہ اس کے اندر غور سے دیکھا پھر دینے والے کے چہرہ پر نظر ڈالی۔ حیرت جاتی رہی شک کی جگہ یقین کامل نے لی۔ اور یہ فوراً اس کے سینہ سے لپٹ گئی۔ جوش محبت نے دل میں حجاب کا خیال تک نہ آنے دیا۔ ایک لمحہ کے لئے دونوں پر محویت کا عالم طاری ہو گیا۔ آنکھیں اٹھیں تو کوئی تیسرا شخص وہاں موجود نہ تھا البتہ تھوڑی دور کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر پڑا۔ اٹھا کر دیکھا تو ایک ملاقاتی کارڈ تھا جس پر مہاراج چھپا ہوا تھا!

(اقبال ورما سحر) ——— (العصر)

فتح کے موتی

۱

بابو جگت نرائن وکیل کے دروازے پر والنٹیروں کا جم غفیر جمع تھا۔ گلے میں، تلے
اور سینوں پر ایک چھوٹا سا رنگ امتیازی پھول ان کی قومی جانبازی کا نمونہ
پیش کر رہا تھا۔ کچھ ادھر ادھر ٹہل رہے تھے کچھ ایک جگہ بیٹھے متانت سے کسی
اہم مسئلہ پر غور کر رہے تھے۔ کہیں کہیں سے تماشائیوں کے قہقہوں کی ناخوشگوار
آوازیں آ رہی تھیں۔

اتنے میں تین چار آدمی وہاں آئے ان میں سے ایک بابو تربینی پرشاد سوشل
ریفارم لیگ کے سیکرٹری نے سیٹی بجائی۔ جس سے والنٹیروں پر خاموشی کا عالم
طاری ہو گیا۔ اور جو جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ اس کے بعد بابو تربینی پرشاد بلند اور
پُرجوش آواز میں بولے "آپ صاحبان بیٹھ جائیں۔ اور غور سے ہمارا فیصلہ سنیں"
یہ سُن کر سب ایک چبوترے پر بیٹھ گئے۔ وہ بولے "بھائیو اس وقت ہماری
لیگ کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ یہی ہمارے امتحان کا موقع ہے اگر اس وقت
ہمارے پیر ذرا بھی لغزش کھا گئے تو اس سے بڑھ کر ہمارے لئے اور کون شرم
کی بات ہو سکتی ہے۔ بولئے آپ لوگ اس غریب قوم کی خدمت کے لئے تیار ہیں
یا نہیں؟"

والنٹیروں نے ایک زبان ہو کر کہا، "بجا ہے جی ہم اس کی خدمت سے منہ نہ موڑیں گے۔"

"ہمیں آپ لوگوں سے ایسی ہی امیدیں ہیں" بابو صاحب نے تقریر جاری رکھ کر کہا۔ "خدا آپ کو اپنے ارادے پر اٹل رکھے۔ اچھا تو سنئیے راجے بہادر نے کہا ہے وہ ہمارے والنٹیروں کو پھاٹک سے اندر نہ جانے دیں گے اور اگر کوئی اندر داخل ہوا تو مار ڈالیں گے۔ . . ."

"ہم موت کے منہ میں خوشی سے جائیں گے" والنٹیروں نے جوش میں بھر کر کہا۔

"اب سوال یہ ہے کہ پھاٹک کے اندر کیسے جایا جائے؟"

"ہم لوگ زبردستی گھس جائیں گے۔"

"خبردار!" بابو تریبنی پرشاد نے تحکمانہ لہجہ میں کہا "خبردار جس کو ایسا کرنا ہو وہ اسوقت یہاں سے چلے جائیں"

والنٹیر دم بخود ہو گئے۔

انہوں نے پھر کہنا شروع کیا۔ "ہماری لیگ کے قواعد میں جبر و تشدد جائز نہیں۔ جن والنٹیروں سے ذرا بھی کسی قسم کی ناخوشگوار حرکت ظہور میں آئی لیگ انہیں سخت سزا دے گی۔ اچھا سنئیے آپ لوگ اسی وقت اپنے پر[illegible] اور پھول اتار دیجیے۔ اور کالی جھنڈیاں جیبوں میں رکھ لیجئے"

والنٹیروں نے فوراً حکم کی تعمیل کی

بابو تریبنی پرشاد بولے "اب ہر شخص ہمیں نہیں پہچان سکے گا۔ ہم تماشائیوں میں مل کر موقعہ کا انتظار کریں گے جس وقت دیکھیں گے کہ دروازہ میں اکیا دن سے یا دن ہوئے میں سیٹی بجاؤں گا اسوقت آپ لوگ فوراً اپنے برتے پہن کر جھنڈیاں نصب کر لیجئے گا"

یہ کہہ کر وہ ذرا رکے پھر جوش سے بولے "اگر ان کی طرف سے کوئی

سختی شروع کی جائے تو فوراً زمین پر لیٹ جایئے گا"

یہ کہتے کہتے ان کی پیشانی پر پسینہ آگیا۔ اور سانس تیزی سے چلنے لگی۔

والنٹیروں نے کہا "ہم ایسا ہی کریں گے"

"آپ صاحبان میں سے جو اس کے لئے تیار نہ ہوں وہ ہرگز ہمارے ساتھ نہ چلیں"

"ہم سب اس کے لئے تیار ہیں" اور والنٹیروں کی آواز سے آسمان گونج اٹھا

۲

آج رائے بہادر بابو اُتم چند کی لڑکی کی شادی ہے شام کا وقت ہے دوار پوجا کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بجلی کے قمقموں سے کوٹھی اور باغ جگمگا رہے ہیں پھاٹک پر بجلی کی روشنی سے جلی حروف میں "خوش آمدید" لکھا گیا ہے رائے بہادر صاحب نے کوٹھی کی آرائش میں ہزاروں روپیہ پانی کی طرح بہا دیا ہے

حکام کو پارٹی دی گئی ہے۔ دعوت کا سارا انتظام رائل ہوٹل کے منتظمین کے ہاتھ میں ہے اوسط درجہ کے لوگوں کا بھی کافی خیال رکھا گیا ہے۔ انہیں شربت اور پان تقسیم ہوں گے۔ یکایک باجوں کی خوشگوار آوازیں آئیں آتشبازی چھٹنے لگی۔ جناتیوں میں ہل چل مچ گئی۔

ذرا دیر میں برات دروازہ پر آگئی۔ نوشہ ایک سجی ہوئی خوبصورت موٹر میں ہاروں اور پھولوں سے لدا بیٹھا تھا۔ گویا پھولوں کا دیوتا ہے بینڈ بج رہا تھا۔ عورتیں استقبال کے لبھاتے ہوئے راگ الاپ رہی تھیں نوشہ چوک پر بیٹھا۔ طرفین کے پروہتوں نے ضروری مراسم ادا کرنے شروع کئے۔ ادھر مہمان میزوں پر چنی ہوئی طشتریوں پر ہاتھ صاف کرنے لگے

رائے صاحب کے منیم جی نے دری کے کام کا ایک عمدہ دوشالہ نکال کر

ایک چاندی کے تھال پر رکھا۔ اور ایک تھیلی سے روپیہ شمار کر کے اس پر رکھنے لگے۔ ہزار ہزار کی سات قطاریں چنی گئیں۔

۳

دفعتاً سیٹی کی آواز سنائی دی۔ بھیڑ میں چھپے ہوئے والنٹیروں نے پرتلے اور پھول پہن لئے اور کالی جھنڈیاں نصب کر لیں۔ بابو تربینی پرشاد چوک کے پاس آگئے۔ رائے بہادر صاحب نے انہیں دیکھا تو آگ ہو گئے۔ وہیں سے بولے "بابو صاحب میں آپ سے کہتا ہوں۔ یہاں آپ لوگوں کی لیگ کام نہ آئے گی ہمارا جو جی چاہے گا کریں گے آپ مخل ہونے والے کون ہیں؟"

بابو تربینی پرشاد نے نرم لہجہ میں جواب دیا "رائے صاحب آپ زیادہ سے زیادہ اکیس روپیہ دے سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کی اجازت لیگ آپ کو نہیں دیتی"

رائے صاحب کڑک کر بولے "ہم لیگ کے ماتحت نہیں ہیں"

"آپ ناراض نہ ہوں لیگ کے قواعد کی پابندی ہر ایک آدمی پر فرض ہے"

تماشائیوں کے مجمع سے آوازیں سنائی دیں "شیم! شیم!"

والنٹیروں نے کالی جھنڈیاں اونچی اٹھالیں دور تک کالے کپڑے کا لہراتا ہوا سمندر نظر آنے لگا۔ رائے صاحب نے جب والنٹیروں کا ٹڈی دل دیکھا تو آپے سے باہر ہو گئے کڑک کر بولے۔

"آپ ان کو یہاں سے دور کر دیں ورنہ ناحق کسی کا خون ہو جائے گا"

بابو تربینی پرشاد کچھ بولنے بھی نہ پائے تھے کہ آواز آئی "ہم جان دئے بغیر ہم یہاں سے نہیں جا سکتے"

یہ سن کر رائے بہادر صاحب نے بھوکے شیر کی طرح ان کی طرف دیکھ پھر گرج کر بولے "دیکھو پانچ منٹ کے اندر تم یہاں سے چلے جاؤ ورنہ تمہاری خیر نہیں"

والنٹیر جوں کے توں کھڑے رہے۔

پھر وہ اپنے نجی سپاہیوں کی طرف دیکھ کر کہنے لگے "انہیں مار کر یہاں سے نکال دو۔ اگر ایک بھی رہ گیا۔ تو تمہاری خیریت نہیں"

سپاہی سناٹے میں آ گئے۔ یہ دیکھ کر رائے بہادر صاحب غصہ سے کانپتے ہوئے ان کی طرف بڑھے

انہیں اپنی طرف آتا دیکھ کر اجڈ سپاہیوں نے ڈنڈے برسانے شروع کر دیئے

بابو تریبنی پرشاد اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور کسی اشارے کے لئے سیٹی بجانے کے لئے منہ میں لگائی ہی تھی۔ کہ ایک ڈنڈا سر پر پڑا۔ ڈنڈا لگتے ہی وہ چکرا کر زمین پر گر پڑے بابو جگت نرائن نے ان کی سیٹی لے کر زور سے بجائی سب کے سب والنٹیر لیٹ گئے۔

حکام پہلے ہی کھانا کھا کر چلے گئے تھے۔ تماشائیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ چند منٹوں میں وہاں سوائے چند براتیوں اور لیٹے ہوئے والنٹیر کے اور کوئی نہ دکھلائی دیا

۴

چوک پر روپیہ پھینکنے کی آواز آئی نوشہ نے کل روپیہ پھینک دیا اور اٹھ کر کھڑا ہونے ہی والا تھا۔ کہ رائے صاحب بولے "بیٹا کیوں بدشگونی کرتے ہو"

نوشہ نے ذرا ترش لہجہ میں جواب دیا "ہم یہاں دوسروں کی جان لینے نہیں آئے"
اس کی آواز رقت سے بند ہو گئی۔

رائے بہادر صاحب لاپرواہی سے بولے "جب تک انہیں یہاں سے دور نہ کروں گا مجھے چین نہ آئے گا"

"تو مجھے بھی انہیں میں سے ایک سمجھئے" یہ کہہ کر وہ زبردستی اٹھا اور جہاں والنٹیر لیٹے تھے جا کر لیٹ گیا

باپ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کسی کی ہمت نہ پڑی کہ اس سے کچھ کہتا شادی کے گھر میں ماتم منایا جانے لگا۔ دروازے پر براتی اکیلے خاموش بیٹھے تھے۔ سب کی زبانیں بند تھیں۔ عورتوں میں کہرام مچ گیا۔ رائے بہادر صاحب کی بیوی نے جب یہ سُنا تو غش کھا کر زمین پر گر پڑی

اُدھر سپاہیوں نے اپنی کارگذاری جاری رکھی لیکن والنٹیر لیٹے ہی رہے جانبازانِ قوم کی زبان سے اُف تک نہ نکلی

دو ڈھائی سو والنٹیروں کے درمیان انہوں نے نوشہ کا خیال نہ کیا۔ دھوکے سے لاٹھی کی ایک ضرب اس کے سر پر بھی لگی۔ لیکن وہ خاموش رہا والنٹیروں نے جب دیکھا۔ کہ نوشہ زخمی ہو گیا تو اسے اٹھانے کو دوڑے۔ لیکن وہ نہ اٹھا اور بولا "مجھے بھی اپنے ساتھ رہنے دیجئے" انہوں نے اس کو اٹھانے کی ہر چند کوششیں کیں۔ لیکن ناکامیاب رہے تب اس کے سر پر رومال باندھ دیا۔ عزیز رشتہ دار بھی پریشان تھے۔ لیکن کسی کی ایک نہ چلتی تھی۔

مار پیٹ بند ہو گئی۔ سپاہیوں کے جوش ٹھنڈے پڑ گئے اور سب اپنی اپنی بچت کی صورتیں سوچنے لگے۔ رائے بہادر صاحب غصہ سے بھرے

اندر بیٹھے تھے۔ ایک ملازم نے آکر ان سے سارا حال بتلایا۔ وہ کچھ نہ بولے خاموش بیٹھے رہے۔ ان کی بیوی اب تک بے ہوش تھیں

آخر پتھر پسیجا ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے آپ ہی آپ ٹپک پڑے وہ اٹھے اور رپوانہ وار زخمی نوشہ کے پاس پہنچے۔ ایسی سکون اور اطمینان کی صورت انہوں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ ان کا دل رو دیا۔ آنکھیں دل کا یہ بار نہ سنبھال سکیں۔ غم سیلاب بن کر آنکھوں سے نکل پڑا وہ روتے ہوئے داماد کی طرف جھکے اور رقت آمیز لہجہ میں بولے "بیٹا مجھے معاف کرو"

اس نے آنکھیں کھولیں اور پھر بند کرلیں

وہ پھر گڑگڑا کر بولے "بیٹا میں نے ایک بڑی غلطی کی ہے۔ مجھے معاف کرو"

وہ اٹھنے کی کوشش کرتا ہوا نحیف آواز میں بولا "میں معافی دینے والا کون ہوں نہیں آپ ان لوگوں سے معافی مانگیئے"

یہ سن کر سب کے سب والنٹیر اٹھ بیٹھے رائے بہادر صاحب ان کی طرف مخاطب ہو کر عاجزانہ لہجہ میں بولے "میری آنکھیں کھل گئیں آپ معاف کریں"

یہ کہہ کر وہ بابو تربینی پرشاد کے قدموں کی طرف بڑھے بہادر سپاہی اس نظارہ کی تاب نہ لا سکا وہ رائے بہادر صاحب کے گلے سے لپٹ گئے دونوں کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے یہ فتح کے موتی تھے۔

والنٹیروں میں پھر وہی تازگی آگئی۔ نوشہ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا براتی اور جناتی گلے ملنے لگے۔

بابو ترمبینی پرشاد نے نوشہ کو گلے سے لگا لیا۔ اور مسکراتے ہوئے بولے
"ہمیں ایسے ہی زخمی نوشہ کی ضرورت تھی"
اس نے آنکھیں نیچی کر لیں
پھر وہی دلکش نغمے شروع ہو گئے۔ پنڈتوں نے منتر پڑھے دوار شروع ہو گیا اس مرتبہ رائے بہادر صاحب نے صرف ایک روپیہ لڑکے کے ہاتھ میں رکھا نوشہ نے مسکراتے ہوئے روپیہ لے لیا۔
یکایک والنٹیروں کی آواز سنائی دی "رائے بہادر صاحب نوشہ مبارک ہو"

(زمانہ) ——— (سچہ کرشن)

شکاری

ا

کسی پہاڑ کی وادیوں میں ایک شکاری رہتا تھا۔ جو اپنے دل بے فکری میں گذارتا تھا۔ دن بھر جنگلوں میں چڑیوں کا شکار کھیلتا پھرتا رات کو ساتھیوں میں بیٹھ کر کھاتا پیتا، گاتا بجاتا، ایک دن اتفاق سے وہ ایک بڑے تالاب کے پاس پہنچا۔ چڑیوں کی تاک میں کنارے پر کھڑا تھا کہ اسے پانی میں ایک عکس نظر آیا آسمان کی طرف سر اٹھایا تو کچھ نہ تھا۔ اب اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اس عکس کو پھر دیکھے تمام دن وہیں کھڑا رہا لیکن رات ہو گئی اور کچھ نظر نہ آیا۔ وہ اپنا خالی جھولا لیے فکر میں ڈوبا ہوا گھر واپس آیا۔ اس کے ساتھی اس کی افسردگی کا سبب پوچھنے لگے۔ لیکن اس نے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ ہاں جب اس کا دلی دوست آگیا تو اس نے اپنے دل کا حال سنایا۔

"آج میں نے وہ چیز دیکھی ہے جو پہلے کبھی نہ دیکھی تھی ایک بڑی سفید چڑیا اپنے چاندی کے سے پر پھیلائے نیلے آسمان کی سیر کر رہی تھی میں نے اس کا عکس پانی میں دیکھا۔ اور اب معلوم ہوتا ہے کہ میرے کلیجے میں آگ لگی ہے میں نے پانی میں ایک چمک، ایک جھلک، ایک عکس دیکھا تھا لیکن اب اس کے سوا میری کوئی تمنا نہیں ہے کہ اسے پکڑ لوں"

اس کے دوست نے ہنس کر جواب دیا۔ کہ "یہ سب یا تو تمہارے دماغ کی ایجاد ہے۔ یا سورج کی کرنیں پانی سے اٹکھیلیاں کرتی تھیں کل تک تم سب بھول جاؤ گے"

لیکن دن گذرتے گئے۔ اور شکاری اکیلا پھرتا رہا۔ وہ پہاڑوں، جنگلوں دریاؤں اور تالابوں میں ڈھونڈھتا پھرتا لیکن اس چڑیا کا کہیں پتہ نہ لگتا تھا اس کے ساتھی کہتے "آخر یہ کس فکر میں ہے"

ایک نے کہا "شاید پاگل ہو گیا ہے"

دوسرا بولا "نہیں اس کی تو اس سے بھی بدتر حالت ہے وہ ایسی چیز دیکھنا چاہتا ہے۔ جو ہم میں سے کسی نے نہیں دیکھی اور اس طرح سب کو حیرت میں ڈالنا چاہتا ہے"

آخر سب نے مایوس ہو کر ایک ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ شکاری اکیلا پھرتا رہا۔

۲

ایک رات وہ دل شکستہ اندھیرے میں روتا پھرتا تھا کہ اسے ایک بڈھا ملا۔ جو اولاد آدمؑ سے زیادہ لمبا اور شاندار تھا۔

شکاری پوچھا "تم کون ہو؟"

بڈھے نے جواب دیا "میں دانش ہوں لیکن بعض لوگ مجھے علم بھی کہتے ہیں میری تمام عمر انہی وادیوں میں گذری ہے۔ لیکن بغیر رنج اٹھائے مجھے کوئی نہیں دیکھتا۔ جن آنکھوں کو میں نظر آؤں انہیں آنسوؤں سے دھلنا چاہیے جیسی جس نے تکلیف اٹھائی ہے ویسی ہی میں اس سے باتیں کرتا ہوں"

شکاری نے کہا "تم یہاں بہت دن رہے ہو۔ مجھے اتنا تو بتاؤ کہ وہ بڑی

چڑیا جس کو میں نے آسمان پر اڑتے دیکھا ہے کیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں اُسے خواب یا فریب نگاہ سمجھوں"

بڈھا مسکرایا "اس کا نام حقیقت ہے جس نے اسے ایک مرتبہ دیکھ لیا۔ پھر اسے چین نہ ملا۔ وہ مرتے دم تک اسی کی آرزو میں رہا"

شکاری بولا "مجھے بتاؤ کہ میں اسے کہاں پا سکتا ہوں"

لیکن بڈھے نے کہا "تم نے ابھی کافی تکلیفیں نہیں اٹھائی ہیں" یہ کہکر وہ غائب ہو گیا۔

شکاری نے اپنے سینہ سے تخیل کی نال نکالی۔ اس پر اپنی آرزوؤں کا سوت لپیٹا اور ساری رات بیٹھ کر ایک جال تیار کیا۔

سویرے اُس نے یہ سنہرا جال زمین پر پھیلایا اور سینے کی جیب سے اعتقاد کے کچھ دانے نکالے جو اس کو باپ سے ورثہ میں ملے تھے۔ اس کو اس نے جال میں ڈالا۔ اور اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ دیکھیے اب کیا ہو۔

پہلے ایک برف سی سفید چڑیا آئی جسکی آنکھیں خوبصورت تھیں اور "اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو" کا شیریں نغمہ زبان پر جاری تھا

دوسری مرتبہ ایک سیاہ اور بعید الفہم چڑیا آئی جس کی کالی کالی آنکھیں دل کو کھینچے لیتی تھیں۔ یہ صرف اتنا گاتی تھی "حیات ابدی"

شکاری نے انہیں ہاتھ میں لیا اور کہا "یقیناً یہ حقیقت کے خوبصورت بچے ہیں"

اس کے بعد ایک چڑیا آئی جس کا سبز اور سنہرا رنگ تھا اور وہ بلند آواز سے چلاتی تھی "موت کے بعد انعام، موت کے بعد انعام" شکاری نے کہا "تم اتنی حسین تو نہیں لیکن تم بھی خوبصورت ہو"

اسیطرح رنگ برنگ کی چڑیاں آتی رہیں۔ جو اچھے اچھے گیت گاتی تھیں۔ جب سب دانے ختم ہو چکے تو شکاری نے انہیں نکالا۔ اور ایک پنجرہ بنایا جس کا نام "مذہب" تھا اس پنجرے میں اس نے سب چڑیوں کو بند کیا۔

لوگ ناچتے گاتے آئے اور اسے گھیر لیا۔

"کیسا خوش قسمت شکاری ہے! کتنا عجیب و غریب آدمی ہے! کیسی دل خوش کرنے والی چڑیاں ہیں کتنے پیارے گیت ہیں!"

کسی نے یہ نہ پوچھا۔ کہ یہ چڑیاں کہاں سے آئیں۔ اور کس طرح پکڑی گئیں ہاں لوگ انہیں اعتقاد کے دانے کھلاتے اور ان کے گرد ناچتے گاتے رہتے شکاری بھی خوش تھا اور دل میں کہتا تھا۔ کہ "یقیناً حقیقت بھی انہی میں ہے۔ ایک دن وہ اپنے پر جھاڑے گی اور میں اس کی برف سی سفید صورت دیکھوں گا"

لیکن دن یونہی گذرتے گئے۔ اور لوگ ناچتے گاتے رہے۔ شکاری پھر رنجیدہ رہنے اور پہلے کی طرح اکیلا پھرنے لگا۔ ایک دن وہ تنہا بیٹھا رو رہا تھا کہ دانش سے پھر ملاقات ہو گئی۔ اس نے بڈھے سے اپنی کارروائی بیان کی۔

دانش نے مسکرا کر کہا۔ "اکثر لوگوں نے حقیقت کے لئے یہ جال پھیلایا لیکن اسے کبھی نہ پکڑ سکے۔ اعتقاد کے دانوں کو وہ کبھی نہیں کھاتی، آرزوؤں کے جال میں اس کے پاؤں نہیں پھنس سکتے اور نہ ان وادیوں کی ہوا میں وہ سانس لے سکتی ہے۔ جو چڑیاں تم نے پکڑی ہیں وہ جھوٹ کی نسل سے ہیں ان کی صورتیں اچھی اور پیاری ہیں، پھر بھی وہ سب جھوٹ ہیں حقیقت ان سے واقف بھی نہیں"

شکاری نے رو کر کہا۔ "تو کیا مجھے بے بس بیٹھا رہنا ہوگا اور میری تمنا کبھی نہ پوری ہو سکے گی؟"

بڈھا بولا۔ "سنو تم نے بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں اور بہت روئے ہو اس لئے

میں جو کچھ جانتا ہوں تمہیں بتاتا ہوں۔ جس کو حقیقت کی تلاش ہو اسے چاہیئے کہ تو ہم کی ان گھاٹیوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے اور اپنے معتقدیان کا ایک تنکا بھی نہ لے۔ اس کو کامل نفس کشی کے ملکوں میں مدتوں پھرنا پڑے گا۔ وہاں بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی۔ اور حرص و ہوا کا مقابلہ کرنا پڑے گا جب روشنی ہو تو اگلے دھوپ والے میدانوں میں جانا ہو گا واقعات کے سخت پہاڑ اس کے سامنے ہوں گے اُن پر چڑھنا ہو گا ان پہاڑوں کے اس پار حقیقت کا گھونسلا ہے"

شکاری بے چین ہو گیا۔ "تو کیا جو کوئی ان شرائط کو پورا کرے وہ حقیقت کو پکڑ سکے گا؟"

دانش نے اپنا سر ہلایا۔ "وہ اسے نہ کبھی دیکھ سکے گا نہ پکڑ سکے گا ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔"

شکاری نے مایوس ہو کر پوچھا "پھر کوئی امید نہیں ہے؟"

دانش نے جواب دیا۔ "سنا ہے کہ کچھ لوگ ان پہاڑوں کی ایک چوٹی سے دوسری چوٹی پر چڑھتے چلے گئے ہیں۔ ان اونچے مقامات پر پھرتے پھرتے کبھی کبھی انہیں چاندی سا ایک سفید پر، جو حقیقت کے بازو سے گرا تھا، مل گیا ایک دن ایسا آئے گا کہ یہ پر کافی تعداد میں جمع ہو جائیں گے ان کی ایک ڈوری بنائی جائے گی اس ڈوری کا ایک جال بنے گا اس جال میں حقیقت پکڑی جا سکے گی۔"

شکاری اٹھ کھڑا ہوا اور بولا "میں جاتا ہوں"

لیکن دانش نے اسے پھر روکا "خوب سمجھ لو جس کسی نے ان وادیوں کو ایک مرتبہ چھوڑ دیا۔ وہ پھر کبھی ان میں واپس نہ آیا وہ ان کے گرد خون کے آنسو ہی کیوں نہ بہایا کرے لیکن اندر قدم نہ رکھ سکے گا اگر یہ چھوڑیں تو ہمیشہ کیلیے

چھوٹیں جس راستے پر تم جاتے ہو وہاں کوئی انعام نہیں ملتا۔ جو جاتا ہے اپنی مرضی سے جاتا ہے۔ کام ہی اس کا انعام ہے۔"

شکاری نے کہا "میں جاؤں گا لیکن بتاؤ تو ان پہاڑوں پر کونسا رستہ اختیار کروں۔"

بڈھے نے جواب دیا "میں حاصل شدہ علم کا بیٹا ہوں۔ اور وہیں جا سکتا ہوں۔ جہاں لوگ پہلے گئے ہیں۔ ان پہاڑوں پر بہت کم لوگ گئے ہیں اور ہر شخص اپنے لئے ایک راستہ بنا لیتا ہے ہر شخص اپنی ذمہ داری پر جاتا ہے۔ میری آواز اس کو پھر نہیں سنائی دیتی۔ میں اس کے پیچھے چل سکتا ہوں۔ لیکن آگے نہیں چل سکتا۔"

اتنا کہہ کر علم غائب ہو گیا۔

۳

شکاری اپنے پنجرے کے پاس آیا۔ اور اپنے ہاتھوں سے اس کی تیلیاں توڑ ڈالیں۔ لوکدار لوہے سے اس کے ہاتھوں میں زخم پڑ گئے۔ کبھی کبھی بنانا بگاڑنے سے آسان ہوتا ہے۔ ایک ایک کر کے اس نے چڑیاں نکالیں۔ اور اڑاتا گیا لیکن جب سیاہ پروں والی چڑیا کی باری آئی۔ تو اس کی خوبصورت آنکھیں دیکھ کر جھجکا چڑیا نے "حیات ابدی" کا نغمہ الاپنا شروع کیا۔

شکاری نے کہا "میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ بہت ہلکی ہے اور کھاتی بھی کچھ نہیں میں اسے اپنے سینے میں چھپا لوں گا اور اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

اس کو سینے میں رکھ کر اس نے کوٹ کے بٹن لگا لئے۔ لیکن چھپانے سے اس کا وزن بڑھنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ پہلو میں سیسے کا ایک ٹکڑا رکھا ہے اور اسے لے کر وہ ان گھاٹیوں سے نکل نہ سکتا تھا۔ مجبوراً اس نے اسے نکالا اور کہنے لگا۔

"اے میرے دل کی راحت کیا میں تجھے بھی نہیں رکھ سکتا۔ ۔ ۔ اچھا جاؤ۔ شاید حقیقت کے نغموں میں کوئی راگ تمہارے گیت کا سا بھی ہو۔ لیکن میں اسے کبھی نہ سن سکوں گا"

دھیرے دھیرے اس نے اپنا ہاتھ کھول دیا۔ اور چڑیا اس کے پاس سے ہمیشہ کے لئے اڑ گئی۔

تخیل کی نال سے اس نے آرزوؤں کا سوت نکال کر پھینک دیا۔ لیکن نال رکھ لی کیونکہ سوت انہیں گھاٹیوں کا بنا ہوا تھا۔ لیکن نال کہیں باہر کی تھی۔

اب وہ چلنے کے لئے تیار تھا لیکن لوگ چلاتے ہوئے آئے اور اسے گھیر لیا۔

"احمق" "بے وقوف، پاگل" "تجھے کس طرح جرأت ہوئی کہ پنجرے کو توڑ کر چڑیاں اڑا دے"

شکاری نے سمجھانا چاہا۔ لیکن اس کی کسی نے نہ سنی

"حقیقت! کیا بلا ہے؟ کسی نے اسے دیکھا بھی ہے تیری چڑیاں سچ مچ کی تھیں ان کا گانا سب سنتے تھے۔ احمق تو ہوا کو زہریلا کئے دیتا ہے"

کچھ لوگ چلائے "پتھر لاؤ۔ ہم اسے سنگسار کر دیں"

بعض تو اتنا کہہ کر چلے گئے "ہم سے کیا مطلب، بے وقوف ہے جانے بھی دو" لیکن بعض نے اس پر پتھروں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ آخر جب وہ زخموں سے ادھ موا ہو چکا تو رینگتا ہوا جنگل کی طرف نکل گیا۔ یہاں دیکھا تو ہر طرف اندھیرا تھا۔

شکاری اسی اندھیرے میں پھرتا رہا چلتے چلتے وہ ایک ایسی تاریک جگہ پہنچا جہاں ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھتا تھا۔ وہ ٹٹولتا ہوا چلتا۔ لیکن جس شاخ کو چھوتا وہ فوراً ٹوٹ جاتی تھی۔ زمین کوئلے سے ڈھکی تھی۔ ہر قدم پر پاؤں دھنسا جاتا تھا۔ اور راکھ اڑ اڑ کر آنکھوں میں جاتی تھی۔ آخر سر پر ہاتھ رکھ کر ایک جگہ بیٹھ گیا اور روشنی کا انتظار کرنے لگا۔

آس پاس کی وادیوں سے ایک ٹھنڈا کرہ اٹھا۔ جس نے اسے گھیر لیا۔ اور

پھر زور سے بارش ہونے لگی۔ اب اس کے ہاتھ پاؤں سرد ہو چلے اور دل بیٹھنے لگا۔

کچھ فاصلہ پر دو شعلے رقص کرتے نظر آئے۔ جو رفتہ رفتہ اس کی جانب بڑھتے آتے تھے۔ ان میں اتنی حرارت تھی۔ کہ دیکھنے سے جان آتی تھی۔ جب یہ شعلے قریب پہنچے۔ تو ان میں دو حسین عورتیں نظر آئیں۔ شکاری نے پوچھا "تم کون ہو؟"

انہوں نے جواب دیا "ہم عیش پرستی کے نام سے مشہور ہیں ہمارے باپ کا نام فطرت انسانی ہے اور ہماری ماں کا نام بے اعتدالی۔ ہماری عمران پہاڑیوں اور دریاؤں کے برابر ہے ہم پہلے انسان کے ساتھ پیدا ہوئے تھے۔ لیکن ہم کو کبھی موت نہیں آتی۔ اور نہ ہم کبھی بوڑھے ہوتے ہیں"

ایک بولی "آؤ میں تمہیں گلے سے لگالوں۔ میرے ہاتھ نرم اور گرم ہیں تمہارا دل بیٹھا جاتا ہے۔ تمہارے ہاتھ پاؤں سرد ہیں میں تمہارے بدن میں گرمی پیدا کر دوں گی اور تمہارے دل کی خواہش بھی پوری کر دوں گی"

دوسری نے کہا "میں اپنی حرارت تم میں منتقل کر دوں گی تمہارا دماغ سردی سے منجمد ہو گیا ہے۔ تمہارے ہاتھ پاؤں مُردہ ہو رہے ہیں۔ لیکن میں ان میں پھر جان ڈال دوں گی اور تم آزادی اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرو گے"

دونوں ایک ساتھ چلائیں "آؤ آؤ۔ ہمارے ساتھ آؤ۔ ہمارے ساتھ رہو تم سے اچھے ہمت والے اس اندھیرے میں بیٹھے رہے ہیں۔ لیکن ہم ان کے پاس آئے تو وہ ہمارے ساتھ ہو لئے۔ اور پھر کبھی ہمارا ساتھ نہ چھوڑا۔ حقیقت ایک خیال ہے توہم کی گھاٹیاں محض مذاق ہیں۔ لیکن دیکھو ہم زندہ ہیں۔ تمہیں ہمارے متعلق کوئی شک نہ کرنا چاہیئے۔ دیکھو ہم میں کیسی گرمی ہے آؤ۔ آؤ۔ ہمارے ساتھ آؤ"

دونوں آ کر اس سے چمٹ گئیں اس کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہو گئی اور رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا۔

شکاری نے دل میں کہا "ہاں میں اس اندھیرے میں کیوں اپنی جان دوں"
لیکن پھر اسے حقیقت یاد آئی۔ اور وہ کہنے لگا "تم میری آنکھوں میں چکا چوند، میرے خون میں جوش پیدا کر سکتی ہو لیکن مجھے وہ چیز نہیں دے سکتیں۔ جس کی مجھے تمنا ہے۔ جاؤ میں اس وقت تک یہاں بیٹھا رہوں گا جب تک مجھے موت نہ آجائے۔ جاؤ۔ جاؤ میرے پاس سے چلی جاؤ"

اس نے اپنا منہ ہاتھوں سے ڈھک لیا۔ اور ان کی باتیں نہ سنیں پھر جو سر اٹھایا۔ تو کچھ دور دونوں روشنیاں ستارے کی طرح چمک رہی تھیں۔ کچھ دیر میں وہ دور جا کر غائب ہو گئیں اور پھر اندھیرا ہو گیا۔

۱۴

آخر کار افق پر ایک دھندلی سی روشنی نظر آئی۔ شکاری اس کی طرف بڑھا جب اس تک پہنچا تو اپنے آپ کو دھوپ میں پایا۔ واقعات اور حقائق کے خشک پہاڑ سامنے نظر آئے۔ ان پر دھوپ تھی۔ اور ان کی چوٹیاں بادلوں میں چھپ گئی تھیں۔ اوپر جانے کے لئے بہت سے راستے تھے۔ شکاری خوشی میں چلّا اٹھا۔ اس نے سب سے سیدھا راستہ اختیار کیا۔ اور چڑھنا شروع کر دیا اس کے گانے کی آواز پتھروں سے ٹکرا کر گونجتی تھی۔ لوگ مبالغہ کرتے تھے۔ پھر بھی اونچائی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ اور نہ سڑک ہی اتنی ڈھالو تھی۔ چند دن، چند ہفتے زیادہ سے زیادہ چند مہینے گذرنے دو اور مجھے اوپر پہنچا سمجھو، وہ صرف ایک ہی پَر کے چننے پر قناعت نہ کرے گا بلکہ اور لوگوں کے چُنے ہوئے پَر بھی سب کے سب جمع کرے گا۔ ان کا جال بُن لے گا۔ حقیقت کو پکڑے گا ہاتھوں سے چھوئے گا۔ سینے سے لگائے گا۔

فتح نزدیک معلوم ہوتی تھی۔ شکاری دھوپ میں گاتا بجاتا چلا جاتا تھا

لیکن کچھ دُور کے بعد راستہ مشکل ہو گیا اس کی سانس پھولنے لگی۔ گانا بند ہو گیا دائیں بائیں بڑی بڑی چٹانیں تھیں۔ جن پہ کائی تک نہ جمتی تھی۔ جگہ جگہ غار تھے جنہیں دیکھ کر خوف معلوم ہوتا تھا۔ کہیں کہیں سفید ہڈیاں بھی نظر آجاتی تھیں رفتہ رفتہ راستے کا نشان بھی مٹنے لگا کہیں کہیں پاؤں کا ایک آدھ نشان نظر آجاتا تھا لیکن کچھ دُور جا کر یہ بھی غائب ہو گئے۔ شکاری اب گانا بجاتا نہ تھا۔ اس نے خود اپنے لیے راستہ نکالنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک بلند دیوار تک پہنچا جس کے پار جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

شکاری نے کہا۔ "میں اس پہ سیڑھی بنا کر چڑھوں گا۔ اس کو پار کیا اور منزل مقصود تک پہنچا۔" ہمت کر کے تخیل کی نال سے اس نے پتھروں کو کھودنا چاہا۔ لیکن ان میں سے آدھے اپنی جگہ پر ٹھیک نہ بیٹھتے تھے۔ اور کبھی کبھی ہفتوں کا کام گر کر دیکھتے دیکھتے برباد ہو جاتا تھا۔ لیکن شکاری استقلال کے ساتھ کام کرتا گیا دل کو یہ کہہ ڈھارس دیتا تھا۔ کہ یہ دیوار پار کی اور منزل مقصود تک پہنچا۔ پھر کامیابی یقینی ہے۔

آخر کار شکاری دیوار کے اوپر پہنچ ہی گیا وہاں کھڑے ہو کر اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ نیچے بہت دُور تو ہم کی گھاٹیاں کہرے میں چھپی ہوئی تھیں اوپر پہاڑ تھے پہلے تو یہ کچھ ایسے اونچے نہیں معلوم ہوتے تھے لیکن اب معلوم ہوا کہ ان کی بلندی کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔ اور نیچے سے اوپر تک بیشمار اونچی اونچی دیواروں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ شکاری کے منہ سے ایک بے اختیار چیخ نکلی۔ اور اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ اب اس کے چہرے پہ زردی اور مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر چڑھنا شروع کیا لیکن اب وہ بالکل خاموش تھا۔ جو لوگ گھاٹیوں میں پیدا ہوئے ہیں وہ ان اونچے مقامات کی

ہوا میں سانس نہیں لے سکتے۔ شکاری کے سینے میں بھی سانس نہ سماتی تھی اور انگلیوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ دوسری دیوار تک پہنچ کر اس نے پھر کام شروع کیا اس کی اونچائی کی انتہا نہ تھی۔ مگر شکاری خاموشی سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس کے اوزار سے سخت پتھروں کے کٹنے کی آواز دن رات آتی تھی۔ برسوں گذر گئے اور وہ اسی کام میں مصروف رہا۔ دیوار بھی آسمان سے ملی ہوئی معلوم ہوتی تھی کبھی کبھی وہ دعا کرتا تھا۔ کہ ان چٹانوں پر کچھ گھاس نکل آئے یا کائی جم جائے تاکہ اس تنہائی میں کوئی جاندار تو اس کا ساتھی ہو۔ لیکن ایسی دعائیں کب قبول ہوتی ہیں۔

کئی برس گذر گئے۔ وہ ان کا شمار اپنی سیڑھیوں سے کرتا جو سال بھر میں بہت تھوڑی بنتی تھیں۔ اب نہ وہ گاتا نہ یہ کہتا کہ میں یہ کروں گا یا وہ کروں گا دن رات کام میں مصروف رہتا تھا۔

رات کو غاروں اور گھاٹیوں سے خوفناک چہرے نکل کر اسے ڈرانے آتے تھے۔ وہ چلا کر کہتے "او اکیلے آدمی اپنا کام بند کر اور ہم سے باتیں کر"

لیکن شکاری جواب دیتا "میری نجات صرف مصروف رہنے میں ہے اگر میں اپنا کام ایک لمحہ کے لئے بھی بند کر دوں تو تم مجھ پر ٹوٹ پڑو گے"

آپنے پاؤں کے پاس غاروں میں دیکھو، سفید ہڈیاں پڑی ہیں تمہارے ہی ایسے بہت سے مضبوط اور بہادر آدمی ان پہاڑوں پر چڑھے لیکن انہوں نے نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ کوشش بے کار ہے اور وہ حقیقت کو کبھی نہ پکڑ سکیں گے اسی لئے وہ یہاں لیٹ کر ہمیشہ کے لئے سو گئے۔ یہ نیند بڑے آرام کی ہے۔ سوتے میں کوئی اکیلا نہیں رہتا۔ اور نہ تھکے ہوئے ہاتھ پاؤں میں درد ہوتا ہے"

شکاری ان باتوں پر ہنس دیا ۔ کیا میں نے اپنی عزیز آرزوؤں کو دل سے اسی لئے نکال ڈالا ۔ کیا میں اندھیرے میں اسی لئے پھرتا رہا ۔ کیا میں نے حرص و ہوا کا اسی لیے مقابلہ کیا ، کیا ان مقامات پر رہ کر میں اسی دن کے لئے محنت کرتا رہا ہوں کہ یہاں لیٹ کر تمہارا شکار بن جاؤں ؟"

شکاری کی آواز سن کر ناامیدی کی آوازیں چوروں کی طرح بھاگ گئیں ۔ کیونکہ بہادر اور مضبوط آدمی کی ہنسی ان کے لئے موت کا پیغام ہے

کچھ دیر بعد وہ چپکے چپکے پھر آ پہنچیں اور کہا "کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے بال سفید ہو چکے ہیں ۔ اور تمہارے ہاتھ بچوں کی طرح کانپتے ہیں ۔ دیکھو تمہاری نال کی نوک ٹوٹ گئی ہے ۔ اگر تم اس پر چڑھ بھی گئے ۔ تو یہ تمہاری آخری سیڑھی ہوگی تم دوسری دیوار پر پھر کبھی نہ چڑھ سکو گے "

شکاری نے جواب دیا " میں سب جانتا ہوں " ۔ اور پھر کام میں مشغول ہو گیا آخر کار جب دیوار کے اوپر پہنچا ۔ تو اس کے چہرہ پر جھریاں پڑ چکی تھیں اور منہ پر مردنی چھائی ہوئی تھی نگاہ اٹھا کر دیکھا ۔ تو پہاڑ اتنے اونچے تھے ۔ کہ ان کی چوٹیاں بادلوں میں چھپ گئی تھیں ۔

لیکن اس کا کام ختم ہو چکا تھا

۵

بڈھا شکاری اپنے دونوں ہاتھ سینہ پر رکھ کر لیٹ گیا ۔ آخر کار سونے کا وقت آ گیا تھا ۔ نیچے وادیاں سفید کہرے سے ڈھکی ہوئی تھیں ۔ لیکن ذرا سی دیر کے لئے کہرہ پھٹ گیا ۔ اور مرتے وقت ایک نظر بچپن کے درختوں اور کھیتوں پر پڑی دور سے اس کو جنگلی چڑیوں کے گانے کی آواز اور لوگوں کے ناچنے گانے کا غل صاف سنائی دیتا تھا ۔ اسے شبہ ہوا کہ اس غل میں اس کے پرانے ساتھیوں

کی آوازیں بھی شامل ہیں۔ اس کا پرانا مکان بھی سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا شکاری کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے سوچا۔ کہ "افسوس جو لوگ وہاں مرتے ہیں ان کا دم اکیلے میں نہیں نکلتا"

وادیوں پہ کہرہ چھا گیا۔ اور شکاری نے اپنی نگاہ پھیر لی۔

"میں نے برسوں جانفشانی سے حقیقت کی تلاش کی لیکن اسے نہ پا سکا۔ اس عرصہ میں میں نے آرام نہیں کیا۔ لذتوں کی خواہش نہیں کی، پھر بھی میں اسے دیکھ بھی نہ سکا۔ جہاں میں تھک کر لیٹتا ہوں۔ وہاں دوسرے نوجوان اور تازہ دم لوگ آکر کھڑے ہوں گے۔ جو راستہ میں نے بنایا ہے۔ اس پر وہ چلیں گے۔ جو سیڑھیاں میں نے کاٹی ہیں ان پر وہ چڑھیں گے۔ اس شخص کا کوئی نام بھی نہ لے گا۔ جس نے انہیں بنایا تھا۔ میرے موٹے کام پر لوگ ہنسیں گے اور پتھر اپنی جگہ سے لڑھکیں گے تو وہ مجھے کوسیں گے لیکن سب میرے ہی بنائے ہوئے راستہ پر چلیں گے۔ اور میری کاٹی ہوئی سیڑھیوں سے چڑھیں گے۔ وہ ایک نہ ایک دن حقیقت کو پکڑ لیں گے۔ لیکن میرے ذریعہ سے۔ کوئی شخص اپنے لئے زندہ نہیں رہتا۔ اور نہ کوئی اپنے لئے مرتا ہے"

بڈھے کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ اگر حقیقت اس وقت بادلوں میں اڑتی بھی ہوتی تو وہ اسے نہ دیکھ سکتا۔ اس کی آنکھوں پر موت کا اندھیرا چھا چکا تھا۔

"میری روح ان کے قدموں کی آواز سن رہی ہے۔ وہ چڑھیں گے ضرور چڑھیں گے"۔

اس نے اپنی آنکھوں کو ہاتھ سے چھپا لیا۔

نیلے آسمان اور ساکن ہوا سے دھیرے دھیرے کوئی چیز گر رہی تھی

وہ آہستہ سے اُڑ کر شکاری کے سینہ پر گری۔ اس نے اسے ہاتھوں سے چھوا۔ یہ ایک پر تھا

شکاری نے اسے سینے سے لگا کر جان دے دی۔

(مشتاق احمد) ——— (زمانہ)

سگِ لیلیٰ

۱

مس لیلیٰ نے اپنے عاشق زار بارٹن سے کہا "آج کی چاندنی رات کیسی سہانی ہے"
بارٹن نے کسی قدر شاعرانہ تصرف کے ساتھ جواب دیا "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب منہ پر ایک سنہری نقاب ڈالے ہے"

اتنے میں ایک تیسرا شخص کمرہ میں داخل ہوا یہ ایک نہایت خوش وضع اور سجیلا جوان تھا۔ جس کے بشرہ سے امارت اور ریاست کے آثار نمایاں تھے آتے ہی اس نے مس لیلیٰ کو مخاطب کر کے کہا "اس وقت افریقہ کے ریگستان میں عجیب بہار ہو گی"

بارٹن گو ایسا خوش لباس آدمی نہ تھا۔ جیسا یہ تازہ وارد نوجوان لارڈ ہربرٹ مگر اس کے چہرہ سے متانت و شرافت ٹپک رہی تھی۔ اس کے خیالات شاعرانہ ضرور تھے۔ مگر زبان میں لسانی نہ تھی۔ یہی وجہ تھی۔ کہ سال بھر سے مس لیلیٰ کے عشق میں گل رہا تھا۔ لیکن یہ حوصلہ نہ ہوا۔ کہ اس سے اپنے دردِ دل کی داستان کہتا اور زخم جگر پر مرہم رکھواتا۔ یا تو اسے کبھی مناسب موقع ہی نہ ملتا۔ یا خیالات دل سے نکل کر ہونٹوں تک آتے۔ اور وہیں سے لوٹ جاتے۔ علاوہ بریں اس کی زبان میں وہ شوخی و طراری بھی نہ تھی۔ جو بے ساختہ دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں اس کے

برعکس لارڈ ہربرٹ نہایت رنگیں مزاج اور رسیلا آدمی تھا۔ زبان میں وہ روانی تھی کہ گھنٹوں گلفشانی کیا کرتا۔ مزاج میں شوخی اور جرأت کا مادہ بھرا ہوا تھا۔ وہ سیاح بھی تھا۔ اور روئے زمین کے بیشتر مقامات کے حالات سے واقف تھا۔ یہ سیاحت اس کے سلسلہ تقریر کی تازگی اور روانی میں بہت مدد کرتی تھی۔ اس نے مس لیلی کو پیرس میں دیکھا تھا۔ جب سے سایہ کی طرح اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ بارٹن کو روز بروز اپنا پہلو کمزور ہوتا نظر آتا تھا۔ جس وقت ہربرٹ کمرہ میں آتا لیلی اس کی طرف ہمہ تن گوش ہو جاتی۔ اور اس کی سیاحت کے واقعات بڑے غور سے سنتی وہ اس کی ایک ایک بات پر مسکراتی۔ اس کے آتے ہی لیلی کا چہرہ شگفتہ ہو جاتا اور وہ بلبل کی طرح چہکنے لگتی۔ بارٹن انہی وجوہ سے ہربرٹ کی صورت سے بیزار تھا۔ اس نے کئی بار ہربرٹ سے ڈویل بازی کا ارادہ کیا لیکن محض لیلی کے خوف سے باز رہا۔ جس وقت لارڈ ہربرٹ موجود ہوتا بارٹن کے ہونٹوں پر سکوت کی ایک مضبوط مہر لگ جاتی تھی۔ وہ گہرے خیال میں ڈوب جاتا۔ اور دل ہی دل میں کہنے لگتا "کیا یہ حسن پرست لونڈا میری ساری زندگی کی آرزوؤں کو خاک میں ملا دے گا؟ میں خوب جانتا ہوں کہ اس کے دل میں لیلی کی محبت نہیں ہے اس میں اب عشق کی قابلیت ہی نہیں وہ صرف لیلی کی دولت کا عاشق ہے۔ مگر افسوس کہ لیلی اس کے دام میں روز بروز آتی جاتی ہے کیا وہ اتنا بھی نہیں دیکھ سکتی۔ اسے اتنی بھی تمیز نہیں! اگر اس میں اتنا احساس نہیں ہے تو وہ اس قابل نہیں کہ میں اس پر جان دوں۔ مگر اب میں جلد تصفیہ کر لوں گا۔ اب یہ آئے دن کی کوفت مجھ سے نہیں سہی جاتی ہربرٹ کی چالوں کا ایک بار ضرور اس سے ذکر کروں گا۔ لیلی کو شاید یہ معلوم نہیں کہ حضرت فاقہ مست ہیں جو کچھ ریاست اور دولت ہے وہ لسانی ہے۔

وہ اس کی چکنی چپڑی باتوں، طمطراق اور نمائشی حرکتوں پر فریفتہ ہو گئی ہے بس اب اس
طلسم کو کھولے بغیر نہیں رہ سکتا۔۔۔"

۲

ایک روز بارٹن اپنے کمرہ میں بیٹھا تھا۔ کہ مس لیلی کا خانساماں دوڑا ہوا آیا اور
کہنے لگا: مسٹر بارٹن ذرا باہر آیئے۔ آپ کو ایک تماشا دکھاؤں۔ لارڈ ہربرٹ کی
صورت اس وقت دیکھنے کے قابل ہے"

بارٹن: کیوں؟ کیا بات ہے؟ ہربرٹ کو کیا ہو گیا؟

خانساماں۔ (ہنس کر) آپ کے پیارے کتے نے ان کا قافیہ تنگ کر رکھا ہے۔
یہ حضرت کتوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ میں انہیں بچپن سے جانتا ہوں۔ کتوں کی صورت
دیکھی اور لرزہ آگیا۔ اس وقت آپ کا روبن چپ چاپ چلا آتا تھا لارڈ صاحب اسے
دیکھتے ہی بھاگے۔ بھاگنا تھا کہ روبن نے دیکھ لیا۔ اور پیچھے پڑ گیا ایک
گھڑ دوڑ سی شروع ہو گئی۔ آگے آگے ذات شریف پریشاں، چہرہ فق، بدحواس ہانپتے
جاتے ہیں پیچھے پیچھے کتا غراتا ہوا تیزی سے دوڑا چلا جاتا ہے ڈر کے مارے اب
گرے جب گرے۔ خیریت ہوئی کہ سامنے ایک درخت مل گیا۔ پھر کیا تھا۔ آپ بڑی
پھرتی سے اس درخت پر چڑھ گئے۔ چل کر ذرا آپ ان کی قطع تو دیکھئے"

بارٹن کو اس وقت وہی خوشی ہوئی۔ جو اپنے رقیب کی ذلت پر انسان کے
دل کو ہوا کرتی ہے۔ باہر آئے اور لپکے ہوئے باغ میں جا پہنچے دیکھتے کیا ہیں کہ لارڈ
ہربرٹ دونوں ہاتھوں سے ایک ٹھونٹھ پکڑے درخت سے چمٹے بیٹھے ہیں
اور روبن اوپر سر اٹھائے انہیں للکار للکار کر اشارہ کر رہا ہے "یہ کیا کہ آسمان پر جا
بیٹھے۔ دم خم ہو تو آجاؤ نیچے" اپنی پُرخروش آواز میں روبن انہیں خیالات کی تصویر
کھینچ رہا تھا بارٹن کو دیکھتا تھا کہ لارڈ صاحب بھرائی ہوئی آواز میں چیخ کر بولے۔

"بارٹن اس موذی کو کسی طرح یہاں سے دُور کرو تم نے اچھا جانور پال رکھا ہے اگر میں اس درخت پر نہ چڑھ جاتا۔ تو اس نے میری ٹانگ پکڑلی ہوتی۔ اسے جلد یہاں سے دفع کرو۔ خدا کے لئے مجھ پر یہ کرم کرو"

بارٹن۔ (ہنس کر) "آپ ناحق اس سے ڈرتے ہیں یہ غریب کبھی کسی کو نہیں کاٹتا بچے تو اس سے کھیلا کرتے ہیں"

ہربرٹ۔ (لجاجت سے) "بھائی جان باتیں نہ بناؤ میری روح فنا ہوئی جاتی ہے۔ (دبی زبان سے) اور تمہیں دل لگی سوجھی ہے"

روبن نے اپنے آقا کو دیکھا تو دم ہلاتا ہُوا اس کے پاس آگیا بارٹن نے اس کے گلے کا تسمہ پکڑکر اسے وہاں سے ہٹایا۔ اور ہربرٹ کی اس درگت کا قصہ سنانے کے لئے مس لیلی کے پاس جانا چاہتا تھا۔ کہ تار والے نے آکر اس کے ہاتھوں میں ایک لفافہ رکھدیا۔ بارٹن نے اسے کھول کر پڑھا تو چہرہ زرد ہوگیا۔ لکھا تھا "جلد آؤ۔ تمہارے والد سخت بیمار ہیں"

بارٹن اپنے کمرہ میں آیا۔ اور سامان سفر تیار کرکے مس لیلی سے رخصت ہونے گیا۔ موٹر کار دروازہ پر کھڑا تھا۔ لیلی نے یہ خبر سنی تو ملول ہوکر بولی "اب کب تک واپس آؤ گے؟"

بارٹن۔ (غمگین لہجہ میں) "غالباً دو ہفتہ میں آجاؤں گا"

لیلی۔ "مگر روبن کو نہ لے جاؤ۔ اسے یہیں میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ اس پیارے رفیق کے بغیر مجھے لمحہ بھر چین نہ آئے گا۔ مطمئن رہو۔ میں اس کو بہت آرام سے رکھوں گی ایسا پیارا کتا میں نے نہیں دیکھا"

بارٹن خوشی سے پھول گیا۔ اور دل ہی دل میں کہنے لگا "اگر تمہاری مرضی پاؤں تو تمہارے قدموں پر میں خود قربان ہوجاؤں۔ یہ کتا کیا چیز ہے کاش مجھے

بھی روبن کی سی قسمت ملی ہوتی۔ پیارے روبن مجھے تجھ پر رشک آتا ہے" (لیلی سے مخاطب ہوکر) "مجھے اس کے چھوڑ جانے میں کوئی عذر نہیں یہ میرے لئے عین خوشی کا باعث ہے"

لیلی۔ "مسٹر بارٹن میں تمہاری اس عنایت کا شکریہ نہیں ادا کرسکتی"

موٹر کار تیار تھا۔ بارٹن اس پر بیٹھ گیا۔ اس کی جھجک نے اسے اس وقت پھر دھوکا دیا۔ اور اظہار محبت کا ایک نادر موقعہ پھر اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ مگر اس وقت اپنی پریشانیوں میں اسے ان باتوں کے سوچنے کی کہاں فرصت تھی

۳

لارڈ ہربرٹ کو جب جان بارٹن کے رخصت ہو جانے کی خبر ملی تو اس کے دل پر سے ایک بوجھ سا اتر گیا۔ اس نے خیال کیا کہ روبن کو وہ اپنے ساتھ لیتا گیا ہوگا۔ یہ دو ہفتے عافیت سے گذریں گے قسمت نے یاوری کی تو اس عرصہ میں میں اپنے دل کے ارمان نکال لوں گا۔ اور پھر کمبخت روبن کی صورت دیکھنے کی مجھے کوئی ضرورت نہ ہوگی۔ یہ سوچتے ہوئے آپ مس لیلی کے کمرہ میں آگئے اور چہرہ کو رنجیدہ بناکر بولے "مس لیلی مجھے یہ سن کر کمال افسوس ہؤا کہ جان بارٹن کے والد سخت بیمار ہیں میں نے ابھی انہیں موٹر کار . . ."

یہ کہتے کہتے لارڈ ہربرٹ چونک پڑا۔ کیونکہ اس نے روبن کو باہر سے آتے دیکھا۔ اس کا رنگ فق ہوگیا۔ اور ادھر ادھر بغلیں جھانکنے لگا۔ مگر مس لیلی نے کتے کو گود میں لے لیا۔ اور بولی "تو اب تک کہاں تھا؟ یہ ناک میں مٹی کہاں سے لگائی آ تیری ناک صاف کر دوں" یہ کہہ کر اس نے اپنا ریشمی رومال نکالا۔ اور اس سے روبن کے نتھنے صاف کرنے لگی۔ پھر لارڈ ہربرٹ سے بولی "کیوں آپ اس کتے کو پسند کرتے ہیں یا نہیں؟ بارٹن اسے لئے جاتے تھے مگر میں نے روک لیا دیکھئے کیسی پیاری صورت

ہے۔ آپ اس سے خوش ہیں؟

ہربرٹ۔ (خوف زدگی کو ضبط کرتے ہوئے) "جی ہاں۔ بے شک۔ بے شک جی ہاں آپ صحیح کہتی ہیں"

لیلی:۔ آپ اس خیال کو کہاں تک۔ صحیح سمجھتے ہیں۔ کہ ہر ایک انسان کی شرافت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے۔ کہ کتے اس سے کس قدر مانوس ہو جاتے ہیں"؟

ہربرٹ۔ (سابق کی طرح ضبط کرتے ہوئے) "آپ کا خیال صحیح ہے۔ بیشک یہ کتا اب بارٹن کے تمنے تک یہیں رہے گا۔ غالباً اصطبل اس کے لئے بہت اچھی جگہ ہو گی"۔

لیلی۔ (چیں بہ جبیں ہو کر) "یہ آپ کیا کہتے ہیں؟ یہ میرا پیارا روبن اصطبل کے کتوں میں سے نہیں ہے۔ میں اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں گی۔ کیوں آپ کا چہرہ اداس کیوں ہو گیا"؟

ہربرٹ:۔ "کچھ نہیں مجھے مکان پر ایک ضروری کام کرنا ہے ابھی ابھی خیال آ گیا۔ معاف کیجئے گا میں جلد حاضر خدمت ہوں گا"

یہ کہہ کر لارڈ صاحب اٹھے روبن ان کی طرف گھور کر غوں غوں کرنے لگا۔ اس غراہٹ کو سنتے ہی ہربرٹ کے ہوش اڑ گئے۔ اپنی قسمت کو اور اس منحوس کتے کو کوستے ہوئے آپ فوراً باہر نکل آئے۔ احاطہ میں لیلی کے خانساماں سے ملاقات ہو گئی۔ ان کا بشرہ دیکھتے ہی وہ تاڑ گیا کہ اس وقت حضرت کے ہوش اڑے ہوئے ہیں کتے سے یقیناً پالا پڑا ہے ہمدرد بن کر کہنے لگا "لارڈ ہربرٹ آپ اس وقت کہاں تشریف لئے جاتے ہیں۔ آج کمبخت روبن نے آپ کو بہت دق کیا۔ اگر ٹھونٹھ پر نہ جا بیٹھتے تو وہ ضرور آپ کو کاٹ لیتا"!

ہربرٹ:۔ مسکرا کر۔ "سچ کہتے ہو۔ تم تو میرے پرانے رفیق ہو"

کاک :- جی میں آپ کا نمک خوار ہوں۔ آپ مجھے اپنا غلام سمجھیں میرے لائق جو کام ہو بے تکلف فرمائیں"

ہربرٹ :- تم جانتے ہو مجھے کتوں کی صورت سے نفرت ہے"

کاک :- جی ہاں میں خوب جانتا ہوں انہیں دیکھتے ہی آپ کی روح کانپنے لگتی ہے"

ہربرٹ " خیر یوں ہی سہی۔ اس شیطان روبن نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اسے کسی طرح یہاں سے دفان کر دو"

کاک :- یہ کیونکر ہو سکتا ہے ؟"

ہربرٹ :- بس زہر دیدو"

کاک :- ارے یہ حضور کیا فرماتے ہیں!

ہربرٹ :- میں دس پونڈ دوں گا۔ سمجھے ؟"

کاک :- حضور ۔ ۔ ۔"

ہربرٹ :- اچھا بیس پونڈ سہی"

کاک :- حضور بہت مشکل کام ہے"

ہربرٹ :- انکار مت کرو پچیس پونڈ مل جائیں گے"

اتنے میں ادھر سے مس لیلی کے چچا کو آتے دیکھ کر ہربرٹ جلدی سے باہر چلا گیا

۴

اس کے دو دن بعد کاک لارڈ ہربرٹ کے پاس گیا۔ لارڈ صاحب بہت افسردہ خاطر نظر آتے تھے کسی فلسفی کا قول ہے کہ بعض اوقات بہت خفیف واقعات انسان کی زندگی میں بڑی بڑی تبدیلیاں کر دیتے ہیں۔ لارڈ ہربرٹ کی زندگی کی آرزوئیں حوصلے اور خوشیاں سب ایک منحوس کتے کے ہاتھوں تباہ ہوئی جاتی تھیں انہیں

اپنی کامیابی میں کوئی شک باقی نہ رہا تھا۔ لیلی اس کی باتوں سے کیسی محظوظ ہوتی تھی مگر اس سڈبن نے سارا خواب پریشان کر دیا یہ کیونکر ممکن تھا۔ کہ اس خوفناک کتے کی تیز چمکیلی آنکھوں کے سامنے ان کی روانی تقریر جاری رہتی۔ ایسی حالت میں گفتگو کا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے

کاک نے لارڈ صاحب کے روبرو تعظیم سے سر جھکا لیا اور کہنے لگا "حضور نے ایک کام کے لئے مجھے پچیس پونڈ دینے کا وعدہ فرمایا تھا"

لارڈ ہربرٹ کا چہرہ کھل گیا۔ مقصد برآری کی صورت نکلتی ہوئی معلوم ہوئی بے صبری کے ساتھ بولے "ہاں ہاں مجھے یاد ہے۔ کہو"

کاک "میں نے اس مسئلہ پر بہت غور کیا مگر اسے خطروں سے بھرا ہوا پاتا ہوں۔ خدا جانے بعد کو کیا ہو۔ کہیں معاملہ کھل جائے تو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ اس لئے میں نے ایک دوسری ترکیب سوچی ہے۔ کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ میرا ایک دوست ہے۔ دابرٹے۔ وہ ایسا کاریگر ہے کہ جس جانور کی صورت چاہتا ہے تبدیل کر دیتا ہے ایسے رنگ روغن لگاتا ہے کہ بڑے بڑے ماہر بھی نہیں بھانپ سکتے اس کے پاس روبن کے قدوقامت کا ایک خوبصورت کتا ہے۔ بہت لیدھا لڑکے اس سے کھیلا کرتے ہیں اس کا رنگ اس وقت سفید ہے مگر رابرٹ کہتا ہے کہ میں اسے بالکل روبن سے ملا دوں گا۔ کوئی تمیز نہ کر سکے گا۔ بس جب دوسرا روبن تیار ہو جائے گا تو اصلی روبن کو زنجیر میں باندھ کر رابرٹ کے گھر میں قید کر دوں گا اور نقلی روبن مس لیلی کو دیا جائے گا"

ہربرٹ نے سوچ کر جواب دیا "کیا ایسا ممکن ہے؟"

کاک "حضور میں نے خود انہیں آنکھوں سے رابرٹ کو گھوڑوں کی صورت تبدیل کرتے دیکھا ہے"

ہربرٹ:- مگر پلی پہچان گئی تو؟

کاک:- یہ ناممکن ہے رابرٹ نہایت ہوشیار آدمی ہے بس صرف معاوضہ طے ہو جانا چاہیئے۔"

ہربرٹ:- اگر میرے خاطر خواہ کام ہو گیا۔ تو تم دونوں کو چار چار پونڈ دوں گا۔"

کاک:- (ہنسکر) حضور دل لگی کرتے ہیں پچیس پونڈ تو محض نہر کھلانے کے لئے دیتے تھے جو بالکل سیدھا سا آسان کام ہے۔ قلب ہیئت نہایت مشکل کام ہے سو پونڈ سے کم میں نہ ہو سکے گا۔"

ہربرٹ:- اوہ! سو پونڈ اور اتنے سے کام کے لئے!"

کاک:- حضور پچیس پونڈ تو صرف روغن اور مسالہ میں لگ جائیں گے۔"

ہربرٹ:- نہیں بھئی اس قدر میں نہیں دے سکتا یہ سودا نہ پٹے گا۔"

کاک:- اچھا تو رہنے دیجئے بندہ اب جاتا ہے۔"

ہربرٹ:- (گھبرا کر) "نہیں نہیں۔ جاؤ مت۔ ٹھیرو۔ پچاس پونڈ میں طے کر لو۔"

کاک:- نہ۔ سو سے کوڑی کم نہیں۔"

ہربرٹ:- اچھا پچھتر۔ ۔ ۔ اسی ۔ ۔ ۔ ۱۰۰ اے لو تمہارا ہی کہنا سہی مگر پہلے میں اس سکتے کو دیکھ لوں گا۔"

کاک:- (خوش ہو کر) حضور خوب غور سے دیکھ لیجئے گا کیا مجال کہ ذرا بھی کوئی پہچان سکے۔"

ہربرٹ:- اور وہ رابرٹ والا کتا سیدھا ہے نا؟

کاک:- حضور ایسا سیدھا اور نیک جیسے گائے اس کے منہ میں انگلی ڈال دیجئے تو بھی نہ کاٹے۔ اور غرانا تو سیکھا ہی نہیں۔ لا کر دکھاؤں حضور کو؟"

ہربرٹ:- ہاں ہاں، ضرور لاؤ پہلے ذرا میں بھی اسے ہلا لوں۔"

تھوڑی دیر میں چالاک کاک ایک سفید رنگ کا میلا کچیلا کتا لے کر حاضر ہوا

رابرٹ نے کہا "یہ کتا رد بھی نہیں بن سکتا"

کاک "اے حضور روغن تو لگ جانے دیں ہمت کیوں ہارتے ہیں عاشقی

میں تو ہمت ہی درکار ہے"

ہربرٹ - اچھا اس کے سر پہ ہاتھ تو رکھو"

کاک - حضور خود ہی رکھ لیں ذرا بھی نہ بولے گا"

یہ کہہ کر اس نے ڈرتے ڈرتے اس کتے کا پہلے ایک کان پکڑا - پھر ذرا ڈھیٹ

ہو کر اٹھا لیا - مگر کتے نے آواز تک نہ نکلی تب لارڈ صاحب کو اور جرأت ہوئی

آپ نے ڈرتے ڈرتے گویا شیر کا بچہ ہے آہستہ سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا کتے

نے خائف اور دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا اور ذرا دم ہلا کر رہ گیا - ہربرٹ مارے

خوشی کے اچھل پڑا اور کہا -

"آج شام تک کام بن جائے ورنہ پھر ایک پونڈ بھی نہ دوں گا"

کاک "بس آج ہی شام کو تے لیجئے"

۵

ایک دن کے بجائے دو دن گذر گئے - اور کاک آتا ہی نہیں ہے - یہ ۴۸ گھنٹے لارڈ

ہربرٹ نے بڑی امید و بیم میں کاٹے کبھی تو بالکل یقین نہ آتا - اور وہ سوچتے کہ کاک نے مجھ سے

شرارت کی ہے اور کبھی امید زیادہ خوشگوار صورت اختیار کر لیتی آخر تیسرے دن

کاک آدھمکا - تو آپ کہنے لگے "سناجی ہمارا تمہارا وعدہ ایک دن کا تھا - آج تیسرا

دن ہے اب میں ایک کوڑی بھی نہ دوں گا سمجھے ؟"

کاک "حضور کام مکمل ہو گیا"

ہربرٹ - اچھی کہہ رہے ہو سچ - ظاہر تو نہیں ہوتا"

کاک "۔اب حضور خود اس کا فیصلہ کرلیں"

دونوں آدمی مس لیلی کے احاطہ میں آئے روبن کی شکل وصورت اور رنگ کا ایک کتا پڑا سو رہا تھا۔ ہربرٹ اسے دیکھ کر بولے" بخدا یہ تو روبن ہے تو مجھے دھوکا دے رہا ہے"

کاک "حضور دھوکا کیا دوں گا یہ کاریگر کی استادی ہے اس سے تو دو دن لگ گئے ذرا اس کے سر پر ہاتھ تو رکھئے"

ہربرٹ "تم خود رکھو مجھے یقین نہیں آتا"

کاک نے نقلی روبن کے سر پر ہاتھ رکھا اس نے پڑے پڑے ایک بار آنکھ کھولی اور پھر بند کر لی اب لارڈ صاحب نے بھی جرأت کر کے اس کی گردن تھپتھپائی۔ کتے نے آہستہ سے دم ہلانے کے سوا اور کوئی بیجا حرکت نہیں کی۔

لارڈ صاحب کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ بولے "بے شک کمال کیا ہے! کمال!"

کاک "تو حضور اب انعام ملے۔ کہ حضور کی جان ومال کو دعا دوں"

ہربرٹ "ایسی کیا جلدی ہے"

کاک "حضور رابرٹ سخت تقاضا کر رہا ہے۔ مجھے ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے"

لارڈ ہربرٹ نے بڑی فراخدلی سے سو پونڈ کا ایک چک نکال کر کاک کے حوالے کر دیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد غیر معمولی سج دھج کے ساتھ اکڑتے جھومتے آپ مس لیلی کے کمرہ میں داخل ہوئے لیلی نے انہیں دیکھتے ہی شکایت کی" لارڈ ہربرٹ میرے کتے کو آج خدا جانے کیا ہو گیا ہے۔ نہ میرے بلانے سے آتا ہے نہ میرے پاس بیٹھتا ہے بس برآمدہ میں چپ چاپ پڑا ہوا ہے"

لارڈ ہربرٹ۔ (نہایت ہمدردانہ لہجہ میں دلدہی کے طور پر) "بدبختی

ہوگئی ہوگی دو ایک دن میں اچھا ہو جائے گا"

یہ کہہ کر آپ نے جاکر روبن کے سر پر ہاتھ رکھا اور بہت غمگساری کے ساتھ بولے "بے چارہ بہت نڈھال ہو گیا ہے ورنہ کیسا ہر دم کھیلتا رہتا تھا۔ مگر آپ گھبرائیں نہیں۔ دو ایک دن میں اس کی طبیعت صاف ہو جائے گی"

آج آپ شام تک مس لیلی کے ساتھ رہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی زبان بند نہیں کی۔ کبھی اپنی جوانمردی کا۔ کبھی اپنی سیر و سفر کا۔ کبھی عجیب و غریب مناظرہ کا تذکرہ کرتے رہے اور لیلی بھی کوئی رفیق نہ ہونے کے سبب سے یا ان کی سعی و جہد کی کوشش کے باعث آج ان سے غیر معمولی اخلاق سے پیش آئی۔

دوسرے دن آپ علی الصباح فرط مسرت سے ہیٹ ہلاتے ہوئے مس لیلی کے کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ باغیچہ کی طرف خراماں خراماں جارہی ہے۔ اور روبن اس کے پیچھے چلا جاتا ہے آپ فوراً باغیچہ کی طرف چلے اور لپک کر لیلی کے سامنے جا پہنچے۔ گڈ مارننگ کے بعد پہلا سوال آپ نے یہی کیا "روبن کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

لیلی "کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی رات بھر بہت سست رہا۔"

ہربرٹ "واقعی!"

لیلی "جی ہاں نہیں معلوم کیا کھا گیا ہے۔ یا خدا جانے کیا بیماری پیدا ہو گئی ہے اگر یہی حال رہا تو میں مسٹر بارٹن کو کیا جواب دوں گی"

ہربرٹ نے دردمند نگاہوں سے روبن کو دیکھا اور پاس آکر دلیری کے ساتھ اس کا کان پکڑ کر کھینچا۔ گویا نیند سے جگانے کی کوشش کر رہے ہیں یہ ایک بہت معمولی بات تھی مگر اس کا ایک نہایت غیر معمولی نتیجہ نکلا۔ ایک بم کا گولا پھوٹ گیا اور ہوا عجیب و غریب آوازوں سے گونج اٹھی روبن ایک بدبڑ

کے گیند کی طرح اچھل پڑا اور لارڈ ہربرٹ کی طرف لپکا۔ لارڈ ہربرٹ کو اب بجز چارو ناچار شانے چت گر پڑنے کے اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ آپ گرے، نیچے آپ۔ اوپر کرسی اور جب اس بم کے گولے کے صدمہ کے بعد ہوش آیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ روبن شعلہ بار آنکھوں سے ان کی طرف گھور گھور کر غرا رہا ہے۔ اور لیلی زور سے اس کے گردن کا تسمہ پکڑ کر روکے ہوئے ہے۔ آپ جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

مس لیلی نے بگڑ کر کہا "آپ نے کیوں اس کا کان کھینچا۔ میں نے کہا نہیں تھا کہ وہ بیمار ہے؟"

لارڈ ہربرٹ۔ (بدحواسی میں) "مجھے۔ ۔ ۔ مجھے خیال آیا تھا۔ ۔ ۔"

لیلی نے ہانپ کر کہا "بھاگو۔ دوڑو۔ میں چھوڑے دیتی ہوں۔ اب مجھ سے نہیں سنبھل سکتا۔ اور تیز بھاگو۔ تیز نکل جاؤ"

لارڈ ہربرٹ بگٹٹ بھاگے۔ پسینہ میں شور بور۔ ہاتھ پاؤں تھر تھر کانپ رہے تھے۔ اور دل دھڑک رہا تھا۔ دل ہی دل میں کہتے جاتے ہیں آج سخت خفیف ہوئے اب میرا رنگ جمنا محال ہے۔ اب بازی ہاتھ سے جاتی رہی یہ سب اس بدمعاش حرام خور کاک کی شرارت ہے"

یہ خیال کرتے ہوئے آپ دور نکل گئے۔ سگریٹ جلایا۔ اور کاک کے مکان کی طرف چلے تو کیا دیکھا کہ وہ سفید کتا جسے کاک نے کل دکھایا تھا۔ آہستہ آہستہ سر جھکائے چلا جا رہا ہے پورا یقین ہو گیا۔ کہ ظالم کاک نے بیٹے بازی کی۔ مگر قہر درویش برجان درویش پھر بھی وہ کاک کے پاس گئے۔ جھلائے۔ چلائے۔ لعنت وملامت کی۔ دھمکایا۔ دغاباز حرام خور۔ سب کچھ کہا۔ مگر یہ سب ہارے ہوئے جواری کا غصہ تھا۔ کاک نے پروا تک نہ کی بولا "حضور میں نے رنگ تبدیل کرانے کے لئے روپے لئے تھے مزاج کا تبدیل کرنا انسان کے اختیار سے باہر ہے

خدا جانے مس صاحب کتوں کو کیا سکھا دیتی ہیں کہ کیسا ہی سیدھا کتا کیوں نہ ہو ان کے ساتھ رہتے ہی شیر ہو جاتا ہے"۔

۲

ہفتے کے بعد ایک موٹر کار مس لیلی کے دروازہ پر آکر رکا اور جان بارٹن اتر پڑا۔

خانساماں نے آکر تعظیم سے سلام کیا۔ بارٹن نے پوچھا "کہو یہاں کا کیا حال ہے؟

کاک "حضور بہت خیریت ہے۔ مس صاحبہ جھیل کے کنارے ٹہلنے گئی ہیں روبن بھی ان کے ساتھ ہے۔ آپ تو خیریت سے ہیں؟"

بارٹن "اور لارڈ ہربرٹ کہاں ہیں؟"

کاک۔ (مسکرا کر) "ان کا حال کچھ نہ پوچھئے روبن نے ان کا مورچہ ہٹا دیا"

بارٹن "کیا اب وہ یہاں نہیں ہیں؟"

کاک "جی انہیں گئے تو آج آٹھواں دن ہے"

بارٹن کے جان میں جان آئی۔ اس نے جھیل تک جاکر مس لیلی سے ملاقات کرنے کا ارادہ کیا۔ اور جھجکتا ہوا جا پہنچا۔ مس لیلی جھیل کے کنارے کھڑی روبن کو بطخوں پر دوڑنے کے لئے اشارہ کر رہی تھی۔ بارٹن کو دیکھ کر اس نے اس سرد مہری کے ساتھ جو بارٹن کے حوصلوں کو خاک میں ملا دیا کرتی تھی اس کے سلام کا جواب دیا مگر روبن دوڑا اور دم ہلا کر بڑی سرگرمی سے اظہار مسرت کرنے لگا۔ لیلی کی یہی متانت یہی رکھائی بارٹن کو سرد کر دیا کرتی تھی۔

مس لیلی نے کہا "کہئے مسٹر بارٹن۔ مزاج کیسا ہے! میں نے آپ کے لئے کوٹھے آرام سے رکھا ہے"

لازم تھا کہ اس کے جواب میں بارٹن کوئی پُر معنی پُر مذاق جملہ کہتا مگر ایسا نہ

پہلے کبھی ہوا تھا۔ اور نہ اس وقت ہو سکا۔

مس لیلی نے روبن کو پیار کر کے کہا "اب تم مسٹر بارٹن کے پاس نہ جانے پاؤ گے۔ کیوں میرے پاس رہو گے نا؟ بڑے آرام سے رکھوں گی"

یہ الفاظ بہت سادہ اور بے رنگ تھے۔ اور نہ یا کسی خاص منشا کے کہے گئے تھے مگر انہوں نے جان بارٹن پر غضب کا اثر پیدا کیا۔ انہوں نے اس روکھی متانت کا خیال دور کر دیا جو اس کی ہمت کو توڑ دیا کرتی تھی۔ ان الفاظ میں اسے ایک خوشگوار اشارہ ایک لہر انگیز تحریک کا اثر محسوس ہوا۔ جس نے اس کی جھجک اور شرمیلے پن کو غائب کر دیا۔ خوف کے بجائے دل میں امید کی طاقت محسوس ہوئی اس نے جلدی سے جھک کر مس لیلی کو پیار کیا اور نشہ محبت سے مخمور ہو کر بولا۔ "روبن اکیلا نہیں رہ سکتا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہوں"

لیلی نے شرمیلی ادا سے سر جھکا کر جواب دیا "خیر کتا تمہارا رہنما تو ثابت ہوا"

(نواب رائے)

(ادیب)

زرد کوٹھی

۱

مَیں گجراتی اخبار جام جمشید کے تازہ پرچہ کو سرسری دیکھ رہی تھی۔ کہ ایک پارسی لیڈی کا اشتہار نظر آیا۔ جس میں لکھا تھا۔ اس کے ہاں ناسک میں چند کمرے کرایہ پر دینے کو خالی ہیں میں خود بمبئی میں رہتے رہتے اکتا گئی تھی بے سوچے سمجھے خط لکھ کر معاملے کر لیا۔ اور اس کے چند دن بعد ایک روز ماہ دسمبر میں شام کے وقت ناسک کے ریلوے سٹیشن پر جا اتری۔ وہاں سے ایک وکٹوریہ کرایہ پر لی۔ اور اپنا مختصر اسباب اس میں رکھوا کر کوچبان سے کہا "مسز نوازبائی کنٹرکٹر کے مکان پر لے چلو ان کے مکان کا نام زرد کوٹھی ہے تمہیں اس کا پتہ معلوم ہے؟"

گاڑی والا تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر کہنے لگا "آپ نوازبائی کی شناسا ہیں؟"

مَیں نے لاپروائی سے جواب دیا "نہیں۔ ان سے مجھ سے پہلے کی ملاقات نہیں ہے میں اول مرتبہ ان کے ہاں کرایہ دار کی حیثیت میں رہنے جاتی ہوں" اس پر اس نے اتنا تعجب ظاہر کیا۔ کہ میرے منہ سے بے اختیار نکلا "شاید تمہیں معلوم نہ تھا ان کے مکان کا ایک حصہ کرایہ کے لئے خالی ہے؟"

وہ بولا "میں اتنا ہی جانتا ہوں وہ کسی زمانہ میں اپنے مکان میں کرایہ دار رکھا کرتی تھیں"۔ پھر اس نے بڑبڑاتے ہوئے چند الفاظ کہے جن کا مطلب میں کچھ نہیں سمجھ سکی

میں نے اس گفتگو کو طول دینا پسند نہ کیا۔ اور وہ گاڑی پر چڑھ کر اسے تیز چلانے لگا۔ میرے ہمراہ ایک بد مزاج کتا تھا جسے میں "سنو" کہا کرتی تھی۔ رستہ بھر اس بات کی فکر رہی کہ نواز بائی کہیں اس کتے کو ناپسند نہ کرے۔ کیونکہ وہ اجنبیوں کو ہمیشہ بری نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ اس وقت دنیا میں یہ کتا میرا واحد رفیق تھا۔ کیونکہ باقی سب سے میرا جھگڑا ہو چکا تھا۔ گذشتہ چھ ماہ کے عرصہ میں میرا اخبار سانجھ ورتمان سے مضمون نگاری کا تعلق تھا۔ مگر کسی بات پہ ایڈیٹر سے بھی تکرار ہو گئی۔ جس کے بعد میں نے بمبئی میں رہنا پسند نہ کیا۔

گاڑی ایک زرد دیوار کے آگے ٹھہری جس کے تنگ دروازہ میں تھوڑے فاصلہ پر جھاڑیوں اور چھوٹے درختوں میں گھرا ہوا زرد رنگ کا مکان نظر آتا تھا میں کتے کو گاڑی سے اتار کر لباس ٹھیک کر رہی تھی۔ کہ میں نے دیکھا گاڑیبان ٹرنگ دروازہ پر رکھ کر پھر گاڑی پر جا بیٹھا ہے۔

میں نے کہا "یہ بکس اندر رکھ آؤ" مگر وہ ترشروئی سے بولا "بائی جی معاف کیجئے گا میری کمر میں شدت کا درد ہے"

اس کی بہانہ سازی پر میں نے کہا "یقیناً ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ اسے یہیں پڑا رہنے دو۔ جاؤ اسے اندر چھوڑ آؤ۔ میں چند پیسے زیادہ دوں گی"

مگر اس نے نہ ماننا تھا نہ مانا۔ بڑے اصرار کے ساتھ یہی کہتا رہا "بائی جی میں قلی نہیں ہوں۔ میرا کام آپ کو یہاں پہنچانا تھا ہاں اگر آپ چاہیں تو پھر کسی روز سٹیشن تک چھوڑ آؤں گا"

میں نے کہا "خیر وہ وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا اور پھر اس وقت میں کسی ایسے گاڑی والے کو بلا لوں گی جو تمہاری طرح کام کو ادھورا چھوڑنے کا عادی نہ ہو"

اتنا کہہ کر میں نے کرایہ کے پیسے اس کے حوالہ کر دیئے اور کتے کو گود میں لئے دروازہ کے اندر داخل ہوئی۔

سامنے برآمدہ میں ایک فربہ اندام ادھیڑ عمر کی عورت کھڑی تھی۔ چہرہ پہ جو چند سال پہلے حسن ملیح کا دلکش نمونہ ہوگا۔ ہلکا استقبالی تبسم تھا اور آنکھوں میں مذاق پسندی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر مادرانہ شفقت سے بولی "تم اس لمبے سفر میں تھک گئی ہوگی۔ ٹھہرو ابھی گرم چائے کی پیالی لاتی ہوں" اتنے میں اس کی نظر میرے کتے "تسنو" پر پڑی تو کہنے لگی "بخدا کیسا پیارا کتا ہے!"

میں نے اسے گود سے اتار کر فرش پر رکھ دیا۔ اور اس خیال سے بہت خوش ہوئی کہ کتے کی نسبت میرا اندیشہ غلط نکلا۔

میں نے کہا "گاڑی والے سے بہترا کہتی رہی۔ مگر ضدی آدمی میرا ٹرنک باہر ہی چھوڑ کر چلا گیا"

اس فقرہ سے نوازبائی کا تبسم دور ہو گیا۔ اور چہرہ پر سپیدی چھا گئی مگر اس نے جلدی ہی لبوں پر مسکراہٹ پیدا کر کے جواب دیا "میں جانتی ہوں یہاں کے گاڑی والے بہت نالائق ہیں۔ ٹھہرو میں خود اٹھا لاتی ہوں"

میں نے کہا "چلو میں بھی چلتی ہوں آپ کے ہاں کوئی خادمہ نہیں ہے؟"

وہ بولی "نہیں مگر میں خود ہر قسم کی خدمت کے لئے حاضر ہوں"

میں نے جواب دیا "کچھ مضائقہ نہیں میں ان دنوں ایک ناول لکھ رہی ہوں اور تنہائی پسند کرتی ہوں چلئے ہم دونوں مل کر ٹرنک اٹھا لاتی ہیں"

۲

میری نشست کا کمرہ بہت خوشگوار تھا۔ اس کی کھڑکیوں سے میدان کا نظارہ جس میں جابجا درخت اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں بہت دلکش تھا۔ کمرہ

کا سامان بھی نیا اور صاف تھا۔ قریب ہی سونے کا کمرہ تھا۔ جس میں نسبتاً تاریکی
تھی۔ مگر نہ ایسی کہ بری معلوم ہو۔ بلکہ اس طرح کی ہلکی جو خود بخود نیند کو کھینچ لائے۔
کمرہ ہر طرح صاف تھا۔ اور انگیٹھی میں آگ جل رہی تھی۔ میں چونکہ رستہ کی تھکی
ہوئی اور سردی کھا چکی تھی۔ اس لئے آگ کے پاس بیٹھ گئی۔ اور کتابوں کا ایک پلندہ
جو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ کھولا۔ ان کتابوں کے ساتھ ایک فوٹو چاندی کے فریم میں
جڑا ہوا رکھا تھا۔ میں چیزوں کو کھول کر قرینہ سے رکھنے لگی تھی۔ کہ باہر سے نوازہ
بائی کی آواز سنائی دی "چائے تیار ہے" جب اس کے بعد میں اس ہال سے گذرنے
لگی۔ جس کے سرے پر میرا کمرہ واقع تھا تو مجھے "ستو" کے بھونکنے کی آواز سنائی دی
جس سے اندیشہ ہوا۔ کہ وہ نوازبائی کے ساتھ ترش روئی سے پیش آ رہا ہے مگر
جس وقت میں نے کمرہ نشست میں نظر ڈالی تو وہ بالکل خالی تھا۔ گو اندازاً
ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ابھی کوئی شخص اس میں سے گذرا ہے۔ عین اس وقت
ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ جس سے میں نے خیال کیا۔ شاید اسی کی وجہ سے کھڑکی کا پردہ
پھڑ پھڑایا ہوگا۔ میرا کتا پہلے مشتبہ طور پر کرسیوں میزوں کو سونگھتا پھر رہا تھا
پھر بڑے جوش سے دانت نکال کر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اس کے بدن پر اس
طرح بال کھڑے تھے۔ جیسے حد درجے کے خوف یا جوش کی حالت میں کھڑے
ہو جاتے ہیں۔ وہ کسی نامعلوم چیز کو دیکھ کر زور زور سے بھونک رہا تھا۔
میں نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ تو باغ میں کوئی متنفس نہ تھا۔ اس لئے
کتے کو چمکار کر کہا "بس اتنا مت بھونکو۔ آؤ میں تمہیں تھوڑی چاء دوں" مگر اس
کے بہت دیر بعد تک۔ وہ برابر غراتا اور بھونکتا ہی رہا۔
ناشتہ کر کے چاء پی چکی تو مجھے اس کی تلاش ہوئی کہ کوئی اچھا موقعہ دیکھ کر
اپنے شوہر کا فوٹو فریم دیوار پر لٹکا دوں۔ میں یہ کہنا بھول گئی کہ اس فوٹو کے اصل

فریدون جی بھروچا سے میری شادی ہوئے صرف چھ ماہ گذرے تھے۔ مگر اس چھ ماہ کے عرصہ میں ہی ہماری تکرار ہو گئی۔ اس کی عمر کا بڑا حصہ جہازی زندگی میں بسر ہوا تھا۔ اس لئے عادتاً مغرور المزاج تھا۔ اور میری رگوں میں مغرور داجیا خاندان کا خون تھا۔ اس لئے میں فطرتاً کسی بات میں دبنے والی نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک معمولی بات پر دونوں کی ان بن ہو گئی۔ وہ پھر جہاز پر ملازم ہو کر کہیں چلا گیا۔ اور میں نے بمبئی کے بعض گجراتی پرچوں میں مضمون نگاری کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جس سے گذارہ لائق کافی آمدنی ہو جاتی تھی۔ دونوں کی جوانی کا عالم تھا۔ اور ناعاقبت اندیشی جو شباب کا جزو لازم ہے۔ دونوں میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ جب وہ مجھ سے جدا ہوا۔ تو مجھے اس کا پورا یقین تھا کہ وہ غلطی پر ہے۔ مگر اب یہ خیال بڑے درجہ تک بدل چکا تھا۔ پس میں نے سوچا کہ کام کرتے وقت اس کا فوٹو میز کے سامنے لٹکا رہے تو برا نہ ہو گا۔ جدا ہوتے وقت میں نے اسے کہہ دیا تھا۔ کہ نہ میں تمہیں خط لکھنا چاہتی ہوں نہ تمہارا خط پڑھنا۔ مگر اس وقت مجھے یہ سوچ کر رنج ہو رہا تھا۔ کہ جب سے وہ گیا نہ مجھے کوئی خط لکھا۔ نہ کوئی تصویر دار کارڈ ہی بھیجا۔ جس میز کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کے اوپر دیوار کے ساتھ ایک فوٹو کسی نوجوان کا لٹکا ہوا تھا۔ میں نے بادی النظر میں خیال کیا وہ نوازبائی کا کوئی رشتہ دار ہو گا۔ مگر قطع وضع میں وہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس کا چہرہ عالمانہ اور فلسفیانہ، اعضاء متناسب آنکھیں بڑی بڑی اور ملائم پیشانی شاعروں کی طرح بلند تھی۔ اور اس کے اوپر اس کے خوشنما ملائم بال سیدھی مانگ نکال کر صفائی سے برش کئے ہوئے تھے۔

میں تھوڑی دیر اس کے چہرہ کی طرف دیکھتی رہی پھر بے اختیار منہ سے نکلا "آہ! مجھے کسی ایسے حلیم اطاعت پذیر، وفادار مرد سے شادی کرنی چاہیئے تھی

جو ہر معاملہ میں میرے اشارہ پر چلتا۔ نہ ایسے ظالم و جابر سے جو قسمت نے مجھے دے دیا" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے شوہر کے فوٹو پر نظر ڈالی۔ جو تند نظروں سے میری طرف گھور رہا تھا" لیکن بہر صورت اس وقت تو تمہیں اپنی جگہ سے اترنا ہی پڑیگا کیونکہ یہ جگہ میں اپنے شوہر کو دینا چاہتی ہوں"

میں نے تصویر کو اتار کر چند کاغذوں پر الٹا رکھ دیا۔ اور اپنے خاوند کی تصویر اس جگہ آویزاں کر دی۔ ہر چند میرا اس سے لگاؤ ہو چکا تھا۔ تاہم ایسا کرتے ہوئے میں نے اسے تبرکاً اپنے لبوں سے چھوا میرے لبوں کے اس بیجان تصویر سے لگنے میں خدا جانے کیا تاثیر تھی۔ کہ دفعتاً دل میں خیالات کا جوش ہوا۔ جو گلے میں آکر رک گیا۔ اور اس وقت تک دور نہ ہوا جب تک میں نے پے در پے دو چھوٹے گلاس سرد پانی کے نہ پیئے۔ پھر اپنی افسردگی دور کرنے کی غرض سے کتے کو ساتھ لئے کمرہ سے باہر چلی گئی۔

۳

واپس آئی تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ تاریکی میں میرا پاؤں فرش زمین پر کسی چیز سے اٹکا۔ عین اس وقت نواز بائی ایک دستی لیمپ ہاتھ میں لئے کمرہ میں داخل ہوئی اس کی روشنی میں میں نے جھک کر دیکھا تو یہ معلوم کر کے سخت پریشان ہوئی کہ میرا قدم ان کے فوٹو پر ہی پڑا تھا۔ تصویر کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ اور فریم بھی مڑ کر خراب ہو گیا۔

میں نے گھبرا کر کہا" نواز بائی یہ کیا ہوا؟ میں نے تو باہر جانے سے پہلے اس فوٹو کو بڑی احتیاط سے دیوار پر لٹکایا تھا۔ وہاں سے اتر کر اس جگہ کیسے آگیا؟"

نواز بائی کے چہرہ پر فکر و پریشانی کی جھلک نمودار تھی کہنے لگی" شاید ہوا سے اڑ کر گر گیا ہوگا" اور پھر جلدی سے فرش پر جھک کر فوٹو فریم اور شیشہ کے ٹکڑے

اٹھانے لگی

اس کی یہ حالت دیکھ کر میں نے بھی نرمی اختیار کی۔ فریم کو ہاتھ سے سیدھا کیا۔ اور پھر اسی جگہ لٹکا دیا۔

اس کے بعد سلسلہ گفتگو جاری رکھنے کے لیے اور اس خیال سے کہ باہم بدمزگی پیدا نہ ہو میں نے کہا "آپ کے یہ کمرے کب سے خالی ہیں؟"

وہ خاموش رہی۔ اور آخر جب میں نے اپنا سوال دوہرایا۔ تو کہنے لگی "تین مہینے سے"

میں نے پوچھا "اس سے پہلے جو لوگ آپ کے یہاں مقیم تھے کتنا عرصہ رہے؟"

کہنے لگی "دو سال سات مہینے"

میں نے نرمی سے کہا "بہت عرصہ رہے لیکن کمرے ایسے خوشگوار ہیں کہ کسی کا یہاں عرصہ دراز تک رہنا ذرا بھی تعجب خیز نہیں"

لیکن میں نے دیکھا۔ اس کی توجہ ایک کرسی کی طرف لگی ہوئی تھی جسے میرا کتا سنو مشتبہ طور پر سونگھ رہا تھا۔ کرسی بڑی آرام دہ نظر آتی تھی۔ میں اس پر بیٹھنے کو ہی تھی کہ لوزا بائی چلائی۔ اور کہنے لگی "دیکھنا اس پر نہ بیٹھنا"

میں نے سیدھی کھڑی ہو کر ادھر اُدھر دیکھا۔ اور کسی قدر تعجب و اضطراب کے لہجہ میں پوچھا "کیوں کیا ہوا؟"

وہ کہنے لگی "معاف کیجئے گا۔ یہ کرسی بہت پرانی اور ٹوٹی ہوئی ہے آپ کے گر جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے میں نے منع کیا۔ گو میں تسلیم کرتی ہوں کہ میرا لہجہ سخت تھا"

میں نے جواب دیا "مجھے تو خاصی مضبوط نظر آتی ہے۔ لیکن یہ واقعی ایسی خراب ہے۔ تو اسے اٹھا دینا بہتر ہو گا"

اس کے بھاری بھرکم چہرہ پر گھبراہٹ کے آثار نمودار تھے کہنے لگی "بیشک۔

آپ کا خیال صحیح ہے مگر یہ کرسی مدت سے یہیں پڑی ہے۔ اس لئے میں اسے اٹھوانا پسند
نہیں کرتی۔"

اس مرتبہ بھی میں ہی نرم ہوئی اور کہا: "شاید کوئی یاد اس کرسی سے وابستہ ہے"
اس نے میری طرف تیز مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ پھر بات ٹال کر صرف اسی قدر کہا
"آپ رات کا کھانا کے بجے کھائیں گے؟"

میں نے ساڑھے دس کا وقت بتایا! کیونکہ چاہتی تھی۔ سونے سے پہلے دو گھنٹے کتاب
کا کچھ حصہ لکھ لوں اس پر میری طبیعت بہت جمتی تھی،

۴

رات کو میں خوب نیند بھر کر سوئی۔ گو میرا کتا "سنو" رہ رہ کر بھونکتا اور غراتا ہی رہا
صبح کو آنکھ کھلی۔ تو کھڑکی میں سورج بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اور نواز بائی ایک
میز پر چار کی ایک پیالی چند بسکٹ اور ایک تازہ پرچہ اخبار کا رکھ گئی تھی۔ میں نے
اخبار اٹھا کر سرسری دیکھا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ وہ جہاز جس میں میرا شوہر ملازم تھا۔
واپس بمبئی آرہا ہے۔ اس سے میرے دل کو گونہ خوشی تو ہوئی۔ تاہم میں نے یہ سوچ کر
ضبط کیا۔ کہ میں اپنا پتہ مکان پر چھوڑ آئی ہوں جسے غرض ہو گی خود چلا آئے گا۔ اس
کے بعد میں نے دیوار کی طرف دیکھا۔ جہاں اس کا فوٹو لٹکا ہوا تھا۔ مگر آپ میرے
غصہ اور جوش کا اندازہ کر سکتے ہیں جب میں نے دیکھا کہ اس جگہ اسی حلیم صورت نوجوان
کی تصویر لٹک رہی ہے۔ اور میرے شوہر کی تصویر کہیں نظر نہیں آتی۔ میں نے اضطراب
کی حالت میں ادھر ادھر دیکھا۔ تو اسے ایک الماری کے پیچھے کسی قدر چھپا ہوا پایا
تصویر کا چہرہ اس طرح کھرچا اور چھلا ہوا تھا۔ جیسے کسی نے چاقو سے خراب کر دیا ہو
اب مجھ میں ضبط کی طاقت نہ رہی اور میں نے بڑے زور سے گھنٹی بجائی۔

نواز بائی کو کمرہ میں داخل ہوتے دیکھ کر میں نے کہا "میں آپ سے معلوم کر۔"

کرنا چاہتی ہوں۔ میرے شوہر کی تصویر کے ساتھ یہ بدسلوکی کس نے کی ہے؟"

نواز بائی کے موٹے موٹے گال تمتما پڑ گئے۔ اور وہ لکنت آمیز لہجہ میں بولی "میں نے تو اسے نہیں چھیڑا"

"تو آخر کون ہے جس نے اس فوٹو کو دیوار سے اتار کر الماری کے پیچھے پھینک دیا اور اس کے بجائے اس فوٹو کو وہاں لگا دیا؟"

نواز بائی میرے غصہ سے ناراض تو نہ ہوئی مگر میں نے دیکھا کہ اس نے تھرتھراتے ہوئے پاس کی ایک کرسی کو ہاتھوں سے تھام لیا۔ گویا اسے فرش پر گرنے کا اندیشہ تھا۔ اس وقت اس کے ہونٹ شدت اضطراب سے پھڑک رہے تھے،

آخر میری طرف دیکھے بغیر اس نے نرم لہجہ میں جواب دیا "بائی جی غلطی میری ہی معلوم ہوتی ہے۔ شاید جھاڑو دیتے میں فوٹو نیچے گر گیا۔ اور میں نے لگاتے وقت یہ نہیں دیکھا کہ کونسا فوٹو لگ گیا ہے"

میں نے اس کی طرف مشتبہ نظروں سے دیکھ کر کہا "اگر ایسا ہے تو واقعی عجیب بات ہے"

اس نے ایک ایسے مجرم کی طرح جو اپنی خطا سے تائب ہو بڑی نرمی سے کہا "بائی جی میرا حافظہ بہت خراب ہے۔ اس مرتبہ آپ مجھے معافی دیں، میں امید کرتی ہوں آئندہ کبھی ایسا نہ ہوگا"

اس کا انداز گفتگو ظاہر کرتا تھا۔ کہ وہ حد درجہ متاسف ہے۔ اس لئے میں خود ہی اپنے غصہ اور جوش پر نادم ہوئی۔ دل میں سمجھا کہ نواز بائی ان تصویروں کا بدلا جانا پسند نہیں کرتی۔ لیکن ایسا کہنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتی۔ پس میں نے اس نوجوان کا فوٹو وہیں دیوار پر لگا رہنے دیا۔ اور اپنے شوہر کا انگیٹھی کے مینٹل پیس پر رکھ دیا۔

۵

اس کے بعد دوپہر تک کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ چونکہ جگہ بڑی آرام دہ اور میرے مشاغل کے مطابق تھی۔ اس لئے میں نے دو گھنٹہ کے عرصہ میں اس قدر کام کر لیا۔ جتنا شہر میں رہ کر دو دن میں بمشکل کرتی تھی۔ نہ صرف میرے خیالات میں غیر معمولی روانی پیدا ہو گئی۔ بلکہ حسب موقع اچھے سے اچھے الفاظ خود بخود قلم سے نکل رہے تھے۔ دوپہر کے وقت کھانا کھانے سے تھوڑی دیر پہلے مجھے باغ میں "سنو" کے زور زور سے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔

اس کے بعد فوراً ہی وہ دم اور کان دبائے چیختا ہوا میرے کمرے میں آگھسا جس وقت میں نے اسے گود میں لیا۔ تو اس کا ایک ایک عضو کانپ رہا تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا کہ معلوم کروں۔ کس سے ڈرا ہے۔ مگر کچھ دکھائی نہ دیا وہاں سے ہٹ کر میں نے دروازہ کھولا۔ اور باہر نکلی تو فاصلہ پر ایک آدمی کی پیٹھ نظر آئی۔ جس نے بھورے رنگ کا پرانا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے وہ درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا۔ معلوم نہیں یکایک اس جگہ ایک غیر مرد کی موجودگی کا یہ اثر ہوا کیا کتے کے لرزہ کا۔ کہ میرے اپنے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے ایک لمحہ کے لئے بدن بالکل سرد ہو گیا۔ اور میں نے سنو کو زور سے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہاں سے جلد جلد قدم اٹھاتی کمرہ میں داخل ہوئی۔ تو اپنی اس بزدلی پر ہنسی آئی۔ کتے کو فرش پر پھینک دیا۔ اور انگیٹھی کے سامنے کھڑی ہو کر ہاتھ تاپنے لگی۔

اس کے تھوڑی دیر بعد جب نواز بائی کھانے کا خوان لے کر آئی۔ تو میں نے اس سے پوچھا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے باغ میں کون پھر رہا تھا؟"

وہ تو لیسے چھچوں کو صاف کر رہی تھی۔ شاید ہمہ تن چپ رہی یا اس نے میری بات ہی کو نہیں سنا۔ پھر دوسرے ... جب میں نے اپنے سوال کو دوہرایا تو کہنے لگی "اوہ

ہاں شاید مالی ہوگا۔ وہ کبھی کبھی پودوں کی دیکھ بھال کرنے آیا کرتا ہے "

لیکن یہ الفاظ کہتے ہوئے بھی اس نے اپنی آنکھیں اوپر نہیں کیں۔ آخر میں نے کہا " میرے خیال میں تو وہ مالی نہ تھا۔ اس کے کپڑے تو پرانے تھے۔ مگر فیشن ایبل ضرور تھے "

نوازہ بائی نے ایک ایسے لہجہ میں جو بالکل بدلا ہوا تھا جواب دیا " ہاں وہ کباڑیا کے ہاں سے پرانے کپڑے خرید لایا تھا "

لیکن جب میں نے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ تو اس پر زردی چھائی ہوئی تھی اور وہ دبی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے پوچھا " نوازہ بائی آج تمہاری طبیعت اچھی نہیں "

کہنے لگی " بائی جی رات سردی لگ گئی تھی۔ اس سے زکام ہو رہا ہے "

لیکن اس کی صورت سے زکام کی کوئی علامت نظر نہ آتی تھی۔

۶

اس روز سہ پہر کو میں " سنو " کو ساتھ لے کر بہت دور سیر کرنے چلی گئی۔ دریا کے کنارہ وہ دیر تک کیچڑ میں لیٹ کر خوش ہوتا رہا۔ شاید اس میں اسے بمبئی کے مرطوب بازاروں کا مزا ملتا تھا۔ گھر لوٹی۔ تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ آسمان پر شفق پھولنے لگی تھی۔ اور ہوائے سرد چل رہی تھی۔

نوازہ بائی نے اس وقت تک میرے کمرہ میں لمپ نہ جلایا تھا۔ اس لئے جب باغ میں داخل ہوئی۔ تو کمرہ میں تاریکی تھی۔ مگر اس تاریکی میں بھی ایسا معلوم ہوا گویا کوئی شخص منٹل پیس کے پاس کھڑا ہے۔ ایک لمحہ بھر کے لئے میں ٹھٹک کر رہ گئی۔ پھر حوصلہ کرکے سوچا " کمرہ آخر میرا ہے۔ اس میں کسی کو داخل ہونے کا کیا حق ہے "

یہ سوچ کر میں نے دروازہ کھولا۔ اور اندر داخل ہوئی۔ انگیٹھی میں آگ

جل رہی تھی اس کی مدہم روشنی میں ادھر ادھر دیکھا مگر کوئی آدمی نظر نہیں آیا۔ البتہ انگیٹھی کے نیچے گرا ہوا ایک مقوہ سا جلتا دکھائی دیا۔ میں نواز بائی کی طرف جانے ہی کو تھی۔ کہ خیال گذرا دیکھوں کیا چیز جل رہی ہے۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا میرے شوہر کا فوٹو ہے۔ اس کا بس کا فریم بدستور تھا۔ مگر تصویر کا بڑا حصہ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ میرے بدن میں کپکپی پیدا ہو گئی۔ جلتا ہوا فوٹو فرش پر گر گیا۔ اور میں اس کی طرف دیکھتی ہوئی آہستہ آہستہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ میرا کتا "سنو" بھی دبک کر پاس آ بیٹھا۔

تصویر جل کر راکھ ہو چکی تو میں دوبارہ ہمت کر کے اٹھی۔ اور دروازہ کے پاس جا کر نواز بائی کو آواز دیتے ہوئے پوچھا" میرے کمرے میں کون آیا تھا؟"

پیشتر اس کے کہ وہ کچھ جواب دیتی اس قسم کی آواز سنائی دی جیسے چینی کا برتن فرش پر گرنے سے ہوتی ہے،

میں نے اندازہ کیا۔ گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ سے کوئی برتن گر کر ٹوٹ گیا ہے جس وقت وہ کمرہ میں داخل ہوئی۔ تو میں نے پھر اپنے استفسار کو دوہرایا اور کہا۔

"میں نے کسی آدمی کو یہاں انگیٹھی کے پاس کھڑے دیکھا تھا۔ وہ کون تھا؟"

اس نے لکنت آمیز لہجہ میں جواب دیا" شاید گھڑی ساز ہوگا جو ہر ہفتہ کلاک کو چابی دینے آیا کرتا ہے"

میں نے سختی سے پوچھا" کیا اب چلا گیا۔ کمبخت نے میرے شوہر کا فوٹو آگ میں ڈال دیا۔"

اس نے گھبراہٹ کے لہجہ میں کہا" ارے رے رے! دیکھو تو کیا لاپرواہ ہے خیر اب تو چلا گیا پر اگلی بار آئے گا۔ تو ضرور اس کے کان اینٹھوں گی کیا فوٹو زیادہ خراب ہو گیا؟"

میں نے جواب دیا "وہ تو چل کر راکھ ہو گیا"

اس کے بعد اپنے کمرہ میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ اور بہت دیر تک آنسو بہاتی رہی

۷

اس رات میں نے بہت عرصہ کام کیا۔ اور جب سوئی تو اس خیال سے خوش تھی۔ کہ میرے کام کا بڑا حصہ ختم ہو چکا ہے۔ ارادہ تھا۔ اگلا دن بطور تعطیل گذاروں گی یا سیر کرتے نواحات چلی جاؤں گی

دوسرے دن نو ۹ بجے کے قریب میں نے نواز بائی کو اپنے کمرے میں بلایا کیونکہ میں اس سے معلوم کرنا چاہتی تھی۔ کہ تاسک کے گرد و نواح میں کون کون سے مقامات قابل دید ہیں۔ مطلع صاف تھا۔ لیکن صبح جو کہرہ پڑا اس کا اثر ابھی کسی قدر باقی تھا۔ اور ہوا میں فرحت بخش خنکی پائی جاتی تھی۔ نواز بائی اس روز غیر معمولی حسین نظر آتی تھی۔ کھڑکی سے رہ رہ کر ہوا کے سرد جھونکے آتے تھے۔ جس سے اس کے رخسار گلاب کے پھولوں کی طرح سرخ ہو گئے۔ وہ میز کے دوسری طرف کھڑی باتیں کر رہی تھی۔ کہ یکایک۔ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور آنکھیں بے نور ہو کر کسی اور چیز کی طرف جو غالباً میرے پیچھے تھی۔ لگ گئیں حیران و ششدر ہو کر میں نے بھی اس کی طرف نظر ڈالی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ کھڑکی کے پاس بلانی کرسی پر کوئی شخص کسی قدر آگے کو جھکا ہوا سر کو اس طرح اٹھائے بیٹھا ہوا ہے۔ کہ گویا ہماری باتیں سن رہا ہو۔ اس نے بھورے رنگ کا پرانا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ سر کے بال ملائم اور ان میں سیدھی مانگ نکلی ہوئی تھی۔ آنکھیں بڑی اور ڈاڑھی مونچھیں منڈی ہوئیں اس کی صورت دیکھتے ہی میں نے سمجھ لیا۔ یہ وہی شخص ہے جس کا فوٹو دیوار پر دیکھا تھا۔ میری توجہ اسی طرف تھی۔ کہ کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا۔ نواز بائی بے حس و حرکت فرش پر پڑی ہے اور میرا کمرہ

"سنتو" بند دروازہ کو کھول کر باہر نکلنے کے لئے چیختا اور فرش کو کھرچتا ہے۔ اس وقت تک میرے دل میں خوف وہراس کو احساس پیدا نہ ہوا تھا۔ لیکن یکایک میرے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور میں نے خود اٹھ کر جھٹ دروازہ کھول دیا۔ "سنتو" تو کمرے سے نکل کر ہوا ہو گیا۔ لیکن مجھے نواز بانی کا خیال آیا۔ اس لئے پچھلے پیروں لوٹی۔ اور اس وقت جو دیکھا۔ تو کرسی خالی پڑی تھی البتہ کھڑکی سے آفتاب کی روشنی کمرہ میں داخل ہو رہی تھی۔ میں اس واقعہ کو شاید ایک خواب پریشان یا متوحش خیال تصور کرتی۔ لیکن اس کی تصدیق نواز بانی کے بے ہوش جسم سے ہو رہی تھی۔ میں ایک طاقتور جوان عورت ہوں۔ نواز بانی کو اسی حالت میں اٹھا کر باورچی خانہ میں لے گئی۔ جہاں اس کے چہرہ پر سرد پانی کے چھینٹے دیئے۔ اور ایک گلاس میں برانڈی اور پانی ملا کر اس کے چند قطرے حلق میں ٹپکائے۔

بارے اس نے کانپتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور کہنے لگی "میں آپ کی توجہ کی ممنون ہوں۔ لیکن اب اندیشہ نہ کیجئے۔ میں ہوش میں آچکی ہوں!"

میں نے کہا "میرا اندیشہ اس وقت تک دور نہ ہوگا۔ جب تک مجھے اس شخص کے حالات سے واقف نہ کرو گی جو کرسی پر بیٹھا ہوا تھا"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور پوچھنے لگی "تو پھر کیا آپ نے بھی اسے دیکھا تھا؟ میں سمجھتی تھی وہ صرف مجھی کو نظر آیا۔ گو میں یقین دلاتی ہوں۔ کہ اس سے پہلے میں نے کبھی اس کی صورت نہیں دیکھی۔ لوگ کہا کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی باغ میں نظر آتا ہے۔ لیکن میں اپنی آنکھوں سے کبھی اس کی تصدیق نہ کر سکی۔ میں خوش تھی کہ تم یہاں آگئی ہو۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ اگر وہ فوٹو والا واقعہ نہ ہوتا۔ تو شاید معاملہ اس حد تک پہنچنے نہ پاتا۔ میں نے سنا ہے اس کی ایک جوان عورت

سے محبت تھی۔ شاید اس لئے وہ اس کو برداشت نہ کر سکا کہ اس کی بجائے کسی اور کا فوٹو لگایا جائے۔"

میں نے حیرت واستعجاب کی حالت میں پوچھا "لیکن یہ شخص کون تھا؟"

وہ بولی "یہ آدمی کبھی میرے مکان میں کرایہ دار تھا۔ ڈھائی سال تک یہاں رہا۔ اور مجھے کبھی اس سے شکایت نہیں ہوئی۔ اس کا رنگ، چونکہ ہمیشہ زرد رہا کرتا تھا۔ اس لئے میرا خیال تھا۔ یہ کمزور یا مریض ہے۔ اس کے علاوہ وہ تھوڑی دیر دن کے وقت ضرور سوتا تھا۔ اور سردی ہو خواہ گرمی اس نے کبھی اس عادت کو ترک نہیں کیا۔ میں اسے بے حد شریف اور حلیم آدمی خیال کرتی تھی حتےٰ کہ ایک واقعہ نے اس کی بڑی سختی سے تردید کر دی"

میں نے بھرائے ہوئے لہجہ میں جس سے کسی قدر خوف مترشح تھا پوچھا "آخر وہ واقعہ کیا تھا!"

کہنے لگی "در حقیقت وہ برا آدمی تھا۔ گو کم از کم میں نے اپنی آنکھوں سے اس کی کوئی برائی نہیں دیکھی شاید تم نے بھی سنا ہو۔ اب سے تین سال پہلے ناسک کے یورپین اور پارسی گھروں میں چوری کی وارداتیں غیر معمولی طور پر زیادہ ہونے لگی تھیں۔ بعد کو معلوم ہوا۔ کہ اصلی چور یہی آدمی تھا جو میرے مکان میں بطور کرایہ دار رہتا تھا۔ اور جس کی صورت ابھی ہم نے دیکھی ہے سنا ہے اتنا چالاک تھا کہ بارہا پولیس اسے گرفتار کرنے سے قاصر رہی۔ اس کے دن کو سونے کا راز بھی اسی سے کھلا۔ کیونکہ رات کو جب میں خیال کرتی تھی کہ سویا ہوا ہے تو چپ چاپ گھر سے نکل جاتا۔ اور چوریاں کرتا تھا۔ لیکن ایک رات اس کے پاؤں کو ضرب آ گئی۔ معلوم نہیں وہ کس طرح اس جگہ تک پہنچا۔ لیکن اگلے روز جب میں نے اسے دیکھا تو اس کا پاؤں بہت زخمی تھا۔ میں نے ڈاکٹر بلوانے کو کہا۔

مگر وہ کہنے لگا - میں خود ہی اس کا علاج کر لوں گا - یہاں تک تاکید کی کہ میں اس کے زخمی ہونے کا کسی سے ذکر نہ کروں - اس اثنا میں ہر وقت اسے پولیس کی آمد کی فکر لگی رہتی تھی - اور بارہا میں نے دیکھا - کہ وہ اسی طرح کرسی پر بیٹھا باہر کی آوازوں کو سنا کرتا تھا - ایک رات کا ذکر ہے - کہ میں اسی کمرہ میں بیٹھی اس کے لئے گوشت پکا رہی تھی - کہ باہر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا - کھولا تو پولیس کے آدمی تھے - میرے روکتے روکتے وہ سیدھے اس کمرہ کی طرف چلے گئے - جہاں وہ رہا کرتا تھا - یکایک دھڑاکے کی آواز آئی - جس وقت میں نے جا کر دیکھا تو وہ مرا پڑا تھا - اسی کرسی میں پستول سے خودکشی کر گیا تھا - خوش قسمتی سے میری عزت پر کسی طرح کا حرف نہیں آیا - کیونکہ میری نیک چلنی کے سب پڑوسی ضامن تھے - اس کمرہ میں جتنا سامان ہے - اس کا اکثر حصہ خود وہی لایا تھا - لیکن بعد میں اس کا کوئی وارث نہ ہوا - اس لئے وہ میرے ہی پاس رہا"

اس کے بعد وہ یہ کہہ کر رونے لگی "کہ افسوس اس غریب کی روح کو بعد مرگ بھی چین نہ ملا"

میں چپ چاپ اس کی داستان سنا کی، اس کی جرأت نہ ہوئی کہ اسے ضبط کی ہدایت کروں - ہم اسی حالت میں بیٹھی تھیں - کہ یکایک کسی نے باہر کا دروازہ زور سے کھٹکھٹایا

۸

میرا دل زور سے دھک دھک کرنے لگا - اور نوازبائی کے منہ سے دبی ہوئی چیخ نکلی -

ہمارے چہروں پر ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں - اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ سوال کر رہی تھی - کہ "کون ہے؟" لیکن کسی میں بولنے یا دروازہ تک جانے کی جرأت نہ تھی - اتنے میں پھر دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی -

اس خیال سے کہ اس بھیانک آواز کو تیسری بار نہ سننا پڑے۔ میں سر سے پاؤں تک کانپتی اور ڈرتی کہ نہ معلوم دروازہ کھولنے پر کیا ہوگا۔ پھاٹک تک پہنچی۔ اور کواڑ کھول دیئے۔ باہر تار کا چپراسی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ سے تار لے کر دیکھا۔ تو میرے نام بمبئی سے آیا تھا۔ مضمون یہ تھا "تمہارا شوہر سخت بیمار ہے جلد آؤ"

اس کے دو گھنٹے بعد میں اور نوازنہ بائی دونوں ناسک سے روانہ ہوئیں وہ اپنی بہن کے پاس جانے کے لئے سورت اور میں بمبئی کو۔ یاد پڑتا ہے اس نے کہا تھا۔ کہ اب میں پھر کبھی اس مکان میں نہ رہوں گی۔ لیکن میرا دل شوہر کی بیماری سے اتنا اداس تھا۔ کہ اس کی باتوں پر توجہ نہ دے سکی۔ میں چاہتی تھی کہ جس قدر جلد ممکن ہو۔ بمبئی پہنچ کر اپنے شوہر سے اپنے قصور کی معافی مانگوں۔ انسان کے مزاج کا بھی عجیب حال ہے جب حقیقی تکلیف یا مصیبت کا سامنا ہو۔ تو ساری کدورتیں خود بخود دور ہو جاتی ہیں بمبئی پہنچی تو دیکھا۔ شوہر کی حالت نازک ہے۔ مگر قسمت میں سہاگ لکھا تھا۔ کہ ہفتوں زندگی اور موت کے درمیان لٹک کر بچ گیا۔ البتہ شب و روز کی تیمارداری نے مجھے بیمار کر دیا۔ اس وقت اس نے ویسی ہی توجہ سے میرا علاج کیا۔ اس کے بعد ہم دونوں میں ایسی محبت ہوئی کہ پھر کبھی تکرار کی نوبت نہیں آئی۔

اس کے دو سال بعد میں نے سورت سماچار کے ایک پرچہ میں نوازبائی کے انتقال کی خبر پڑھی۔ اور اس وقت پہلی بار میں نے اپنے شوہر سے ناسک والے معاملہ کا حال بیان کیا۔ بظاہر اس نے اسے ایک معمولی بات سمجھ کر میرے واہمہ سے منسوب کیا۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ دل میں وہ

ایک ایک بات کو سچ سمجھتا تھا۔

چھ ماہ گذرے میرا پھر ایک بار ناسک جانا ہوا۔ وہ جگہ جہاں زرد کوٹھی واقع تھی۔ اب بہت آباد ہو چکی ہے۔ جا بجا اونچے اونچے مکانات بن گئے ہیں۔ مگر اس کی کہنہ دیواریں اب بھی بدستور کھڑی ہیں۔ اور اس کے باہر اس قسم کے حروف میں جو اثرات زمانہ سے بہت مدہم ہو چکے ہیں اس وقت تک لکھا ہے:۔

بھاڑے آپو الو چھے

(کرایہ کے لئے خالی ہے)

(تیرتھ رام)

(ترجمان)

ثباتِ عشق

۱

نشاط منزل صوبہ ماتوہ میں دریا کے کنارے ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ تاریخ کے صفحات اس کی تعمیر کا صاف صاف پتہ نہیں بتاتے۔ البتہ قرب و جوار کے باشندے اس کی تعمیر کے متعلق دلدوز روایات سناتے ہیں۔ اور دیہاتی نظموں سے اپنے بیان کی تائید کرتے ہیں۔ جو ان تک سینہ بہ سینہ پہنچی ہیں۔ اور جن کو وہ دلاویز لہجہ میں یکتارہ پر گا گا کر نہایت جوش و خروش کے ساتھ خود آبدیدہ ہوتے ہیں۔ اور سننے والوں کو رولاتے ہیں

جذباتِ لطیف میں پروردگارِ عالم نے عجیب کیفیت پیدا کی ہے۔ بنی نوع انسان کا ہر طبقہ ان سے حسب استعداد لطف اندوز ہو کر دنیا کی آلودگی اور کثافت سے بے پناہ گزیں ہوتا ہے۔

تعمیر کنندہ کی سیر چشمی، خوش مذاقی اور وسیع النظری، منظر کی خوبی، عمارت کے نظام، باغ کی وسعت اور ترتیب سے نمایاں ہے۔ باوجودیکہ فی الجملہ باغ کی ترتیب ان دنوں محض ایک تفریح گاہ کی سی ہے۔ لیکن اس کے سیر کرنیوالوں پر کم از کم تھوڑی دیر کے لیئے ایک خاص قسم کی سنجیدگی جو غم زدگی کے قریب تک پہنچی ہے۔ طاری ہو جاتی ہے

اگرچہ یہ باغ قبرستان کے ملحق نہیں معلوم ہوتا ہے لیکن روایات مروجہ نے اس عمارت اور فضا کے اردگرد ایک ماحولِ غم پیدا کر دیا ہے۔ جس سے ہر شخص جس کو وہاں جانے کا اتفاق ہوتا ہے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا معلوم ہوتا ہے کہ کسی منچلے تاجدار نے اپنے عشق و محبت کی غم زدہ پیکر کو اینٹ پتھر اور چونے کا لباس پہنا کر کم سے کم اپنے خیال میں لافانی بنا دیا ہے۔

افسوس حضرت انسان اپنی کوتاہ نظری کے ہاتھوں ہمیشہ بقا و دوام کے لاحاصل تجسس میں مبہوت رہے ہیں۔ اپنی اور اس دنیائے گذشتنی کی اصلیت کو فراموش کر کے کہیں اس قفس عنصری کو دواؤں اور مسالوں کی امداد سے ہمیشہ کے لئے محفوظ و برقرار رکھنے کا خیال کیا گیا ہے کہیں عمارت اور کتبہ جات سے بقائے تام کی کوشش ہوئی ہے اور کہیں اولاد، جائداد تصانیف وغیرہ سے حیات جاوید کی غیر ممکن الحصول خواہش کو وابستہ کیا ہے۔ درحقیقت یہ بے سود تدبیریں دنیا اور موجوداتِ دنیا کی بے ثباتی اور فانی الاصل ماہیت کو ثابت کرتی ہیں ؎

حرص و ہوائے سرائے فانی نہ گئی
تا زیست امیدِ کامرانی نہ گئی
ہے لوحِ مزار پہ مرا نقشِ رواں
مر کر بھی امیدِ زندگانی نہ گئی

ملکۂ شب کو مملکتِ فضا کا جائزہ لئے ہوئے کئی گھنٹے گذر چکے ہیں اس کے نورانی اہلکار و کارکنان بساطِ فلک پر حسب مراتب متمکن و مصروف کار ہیں تاریکی و ظلمت نقرئی شعاعوں کی چیرہ دستی سے تنگ آ کر کونوں کھدروں میں جا چھپی ہے دنیا ایک کرۂ نور معلوم ہوتی ہے۔ دنیا والے، سارے دن کی

کشمکش، چقلش و محنت کے بعد میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ ملکۂ شب کی چند گھنٹوں کی پُر سکون حکمرانی نے کایا پلٹ کر دی ہے۔ ہر جانب سکون و خاموشی طاری ہے۔ اور معلوم نہیں ہوتا۔ کہ یہ وہی دنیا ہے۔ جہاں تھوڑی دیر قبل اس قدر کشمکش، قیل و قال، شور و غل اور جنگ و جدال جاری تھا۔ کہ جس سے آسمان والے پناہ مانگتے تھے۔

اس سکون نے فضا کی نورانی خلعت میں خاص کیفیت و دلاویزی پیدا کر دی ہے۔ جس سے اہل دل پر محویت طاری ہو جاتی ہے۔ فرش دریا کو نورانی چاندنی نے فرشِ زر بنا دیا ہے۔ جس میں ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکوں کے باعث بے شمار جگمگاتی ہوئی شکنیں پڑتی اور خود بخود فنا ہو جاتی ہیں۔

آس پاس کی پہاڑیاں سایہ کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے نہایت سنجیدگی سے ایستادہ اور محو نظارہ ہیں۔ چاندنی نے باغ میں ایک متحرک دھوپ چھاؤں کا فرش بچھا رکھا ہے۔ ہلکے ہلکے روح پرور ہوا کے جھونکے نونہالان چمن میں وجد کی کیفیت پیدا کئے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی پپیہے کی جگر خراش، پی کہاں، پی کہاں عالمگیر سکوت میں رخنہ اندازی کرتی ہے۔ اور چوٹ کھائے ہوئے دل کو بے قابو بنا دیتی ہے۔

جب تاجدار مالوہ نے سرکار برطانیہ کی باجگذاری میں عافیت ڈھونڈھی اور انگریزوں کی خدمت کو امن و فلاح دنیوی کا ذریعہ قرار دیا تو "نشاط منزل" کو اس حکمت عملی اور اپنے بے نظیر منظر کی بدولت وہ دن نہ دیکھنا پڑے جن سے اس قسم کی مرصع عمارتوں کو زمانہ کے ہاتھوں عموماً دوچار ہونا پڑتا ہے وہ مہمان خانہ اور تفریح گاہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ جس میں انگریز افسران عموماً آرام و تفریح و شکار کی غرض سے تعطیل کے دن گذارتے تھے۔

جس وقت کا تذکرہ ہے۔ اس وقت ایک نوعمر انگریز پولیٹیکل افسر جان سن اس میں

بہ حیثیت مہمان مقیم ہیں۔ یہ صاحب سرکارِ انگلشیہ کے سیاسی محکمہ میں ایک مقتدر عہدہ پر فائز رہیں۔

ندرتِ شکل، چھب و انداز، نشست و برخاست، شستہ طور و طریقہ زبانِ حال سے ان کی اعلیٰ تعلیم و تربیت تہذیب اور شرافتِ خاندانی کا پتہ دیتی ہے۔ فطرت نے ان کی طبیعت کو تنہائی پسند بنایا ہے

حسین چہرہ کی حزن آمیز سادگی اور متانت ان کے جسم کی دلاویز رعنائیت ہر ملنے والے کی طبیعت میں ایک خاص کشش اور دلچسپی پیدا کر دیتی ہے۔

جن اصولوں کی تحت میں قدرت نے اپنی نعمتوں کو بنی نوع انسان پر تقسیم کیا ہے۔ اب تک نامعلوم ہیں۔ سطحی نظر والے ضرور کہیں گے۔ کہ ان صاحب کے ساتھ قانونِ قدرت نے جنبہ داری برتی کہ بہت بڑا حصہ ان خصائل کا عطا کر دیا ہے۔ جو اس دنیائے فانی میں عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

صاحب بہادر کی سی طبیعت کے آدمی کے لئے اس رات کا دلکش منظر جو کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ اس کی تفصیل کا تذکرہ قلم کے امکان سے باہر ہے یہ ایسے محو ہو گئے۔ کہ عرصہ تک باغ میں دریا کے کنارے سیر کرتے اور محظوظ ہوتے رہے۔ بالآخر رات زیادہ گذرنے پر اپنے کمرہ میں گئے اور بستر پر لیٹ کر باغ کو دیکھتے دیکھتے سو گئے۔

۲

کچھ ہی دیر سوئے ہوں گے کہ کسی نے ان کا شانہ ہلایا۔ آنکھ کھولتے ہی ایسا منظر پیش نظر ہوا۔ جس نے انہیں متحیر کر دیا۔ دیکھا کہ ان کی جگانے والی ایک نازنین اور بے حد خوبصورت لڑکی تھی۔ جو حسن و جھب کے لحاظ سے حورِ جنت معلوم ہوتی تھی۔ اس حور کا لباس و زیور شاہانہ ہندوستانی قسم کا تھا۔ زیورات میں

سب سے زیادہ نمایاں ایک مرصع کڑا تھا۔ جو یہ نازنین بائیں ہاتھ میں پہنے ہوئے تھی۔ روشنی کے باعث بازگشت شعاعیں اس کڑے کے جواہرات سے نکل کر نظر کو خیرہ اور سارے کمرہ کو منور کیے دیتی تھیں۔

لیکن داہنی کلائی اس کے جوڑے کے کڑے سے خالی تھی!

صاحب بہادر کو ساری عمر ایسے مکمل حسن کے دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ وہ عالم خواب میں ہیں یا عالم بیداری میں۔ آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھے لیکن حیرت کی تصویر مجسم بن گئے۔ خیالات کو مجتمع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن بلا نتیجہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن زبان اپنا فرض ادا کرنے سے انکار کرتی تھی۔ یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہنے پائی۔ وہ نازنین پلنگ کے پاس سے ہٹ کر دروازہ کی جانب بڑھی۔ اور فرانسیسی زبان میں نہایت شیریں اور دلدوز آواز میں ان سے کہا۔ "آئیے میرے ساتھ آئیے"

یہ فوراً پلنگ پر سے اٹھے۔ اور بلا جواب دیئے مدہوشی کی حالت میں مشین کی طرح نازنین کے پیچھے ہو لیے۔ مکان اور باغ سے نکل کر دریا کی گھاٹی کے نشیب میں دونوں اتر گئے۔ اور پانی کے کنارے کچھ دور تک ناہموار راستہ پر چلنے کے بعد وہ نازنین ایک غار کے دہانے پر پہنچی۔ اور فوراً اس میں اتر گئی۔ اپنے ساتھی کو بھی اس نے بلایا۔ یہ بھی بلا سوچے اس ڈرمن کے جوف میں اتر گئے اندر بالکل اندھیرا تھا۔ آس پاس کی چاندنی اور ایک نورانی شعاع نے جو اوپر کی پہاڑی شق ہو جانے کی وجہ سے غار کے اندر آ گئی تھی۔ اتنی روشنی پیدا کر دی تھی۔ کہ جس کی مدد سے بدقت تمام اس جگہ پہنچ سکے۔ جہاں وہ نازنین ٹھہر گئی تھی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں چاند کی شعاع براہ راست پڑتی تھی۔ بصارت کی تاریکی سے مناسبت ہو جانے کی وجہ سے اب وہ غار اتنا تاریک معلوم نہیں ہوتا تھا

جیسا کہ داخلہ کے وقت غور کرنے پر اُن کو معلوم ہوا تھا۔ اس موقع پر ان کو ایک دیوار سی بنی ہوئی دکھائی دی۔ جس کو مرورِ ایام نے جا بجا منہدم کر دیا ہے۔ نازنین نے فرانسیسی زبان میں ان سے کہا: "کاغذ کو نکال لیجیے۔ اور پھاڑ ڈالیے"۔

دیوار کے منہدم حصے کو بغور دیکھنے پر ایک کاغذ جو کسی چیز پر رکھا ہوا تھا اس کو انہوں نے نکال لیا۔ اور حسبِ الحکم پھاڑ ڈالا۔ لیکن پھاڑنے کے بعد ٹکڑوں کو وہیں پھینک دیا۔ نازنین غار کے دہانے کی جانب رجوع ہوئی۔ اور حسبِ اشارہ یہ بھی پیچھے ہو لئے۔ غار سے نکل کر دریا کے کنارے کنارے دونوں باغ میں پہنچے۔ نازنین صاحب کے کمرہ کے دروازہ تک ان کے ساتھ آئی۔ اور ہدایت کی "اندر جائیے" یہ اندر چلے گئے۔ اس نے نہایت حزن آگیں و جگر خراش شیریں آواز میں ان سے کہا: "الوداعی سلام"

اور اس کے بعد باغ میں ہو کر دریا کی گھاٹی میں اتر گئی۔

اب تک صاحب بہادر کٹ پتلی کی طرح نازنین کے حکم کی تعمیل کر رہے تھے ان کی عقل مختل تھی۔ اور حواس پر قابو نہ تھا۔ نازنین کے رخصت ہو جانے کے ایک لمحہ بعد خیالات کچھ مجتمع ہوئے۔ اور پکارنے کی کوشش کی۔ لیکن متحرک پتوں کی دلآویز سرسراہٹ کے سوا کوئی جواب نہ ملا۔ فوراً کمرہ سے باہر نکلے۔ اور نازنین کی تلاش میں باغ اور اس کے بعد دریا کی گھاٹی میں سرگردانی کی۔ لیکن بجز سنسان، دلآویز منظر چاند کی کرنوں کا فرش دریا سے اٹکھیلیوں کا سماں اور پتھروں کے انواع و اقسام کی شکلوں کے سایہ کے کچھ نظر نہ آیا۔ کئی گھنٹے کی بے نتیجہ تلاش کے بعد اپنے کمرہ میں واپس آئے۔ ان کی پریشانی اور سراسیمگی نے نیند کو پاس نہ پھٹکنے دیا۔ باقی رات نہایت بے چینی کے ساتھ بسر ہوئی اور صبح ہوتے ہی پھر اس غار کی تلاش میں مصروف ہوگئے۔

لیکن بالکل بے کار۔ نہ اس غار کا پتہ چل سکا نہ راستہ کا۔ جس پر دات کو اس نازنین کے ہمراہ گئے تھے۔

نازنین کی تھوڑی ہی دیر کے ساتھ نے صاحب بہادر کے دل و دماغ پر بڑا شدید اثر پیدا کر دیا۔ جو کسی طرح جنون سے کم نہ تھا۔ اس جنون نے محض ان کے دماغ اور حواس ہی کو پریشان نہیں کیا۔ بلکہ ان کے وجود کی گہرائی اور روح تک متاثر ہو گئی تھی۔

اتفاقات زمانہ میں بھی عجیب ستم ظریفی ہے۔ صاحب بہادر تفریح، آرام، سیر و شکار، اور درستی صحت جسمانی و دماغی کے خاطر اس مکان میں آئے تھے۔ جنون اختلال، دماغ اور روح کی کلپن لے چلے۔

ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد، جس میں واقعات کے حل کرنے کی حتی الوسع ناکامیاب کوشش جاری رہی۔ اپنے مستقر کی جانب روانہ ہو گئے۔ فرائض منصبی کی ضروری مصروفیت نے بھی طبیعت کو درست نہ کیا۔ اور ان کو محسوس ہوا کہ وہ کسی کام کی انجام دہی کے قابل نہیں ہیں مجبوراً رخصت لے کر ولایت روانہ ہو گئے۔

۳

وطن پہنچنے پر قریب قریب ہر تفریح گاہ میں فراموشی واقعات اور سکون قلب کی غرض سے قیام کیا۔ لیکن طبیعت رو بہ اصلاح نہ ہوئی۔ بھولنے کی بجد کوشش کے باوجود نازنین کا جگنا اس کے حسن اور زیوروں کی جگمگاہٹ ساتھ آنے کا حکم۔ اس کی آواز۔ اس کے الفاظ، اس کا آگے آگے چلنا وغیرہ وغیرہ۔ غرض جملہ واقعات ان کے دماغ کے اسٹیج پر ہر وقت مسلط رہتے تھے اور ان کی پریشانی میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ کبھی کبھی یہ بھی خیال آتا تھا

"کیا مجھے بقیہ ایام زندگی پاگل خانے میں بسر کرنا پڑیں گے؟"

ایک روز اتفاقاً باڈلین لائبریری یعنی کتب خانہ کے پاس سے گذر ہوا بلا کسی خاص ارادہ کے اندر چلے گئے۔ اور کتابوں کی الماریوں کو دیکھنے لگے۔ ان کی نظر ایک کتاب پر پڑی۔ جس پر تاریخ مالوہ تحریر تھا۔ اس کتاب کو نکلوایا۔ اور ایک میز کے قریب بیٹھ کر اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ روپ متی کا عشق کی سجدہ گاہ پر جان کو قربانی چڑھانے کا تذکرہ نظر سے گذرا ان کی رگ جنون پر ان تاریخی واقعات نے مضراب کا کام کیا۔ ایک عجیب قسم کی محویت طاری ہوئی۔ جس سے ان کی روح کی کلفت میں اضافہ ہوگیا۔ تھوڑی دیر تک اٹھ کر ٹہلے۔ لیکن ایک غیر معمولی کشمش نے ان کو پھر کتاب کی طرف گھسیٹا۔ اور یہ اس کے قریب پہنچ کر پھر ورق گردانی کرنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ان کی نظر ایک دوسرے واقعہ کی تفصیل پر پڑی۔ جس کے مطالعہ میں منہمک ہو گئے۔

انگریزوں کے تسلط کے کچھ دنوں قبل ہندوستان میں طوائف الملوکی کا دَور دَورہ تھا۔ دہلی کی مرکزی حکومت کی کمزوری نے ہندوستان میں صدہا چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم کر دی تھیں۔ جو آئے دن ایک دوسرے سے دست و گریباں رہتی تھیں۔ اس زمانہ میں یورپ کے قسمت آزماؤں نے ہندوستان کو اپنا راستہ بنا لیا تھا۔

قریب قریب ہر بڑی ریاست میں ان کا در خور تھا۔ اور یوروپین طریقہ پر ہندوستان کی فوجوں کی ترتیب ان کا کام تھا۔ مالوہ کی سلطنت میں بھی ایک فرانسیسی افسر سپہ سالاری کے عہدہ پر مامور ہوا۔ تھوڑے دنوں کام کرنے کے بعد اس نے وطن سے اپنے متعلقین کو بلا لیا۔ جن میں ایک نوجوان

لڑکی ایک نو عمر پرائیوٹ سیکرٹری اور دیگر افراد تھے۔ یہ لڑکی حسن صورت و سیرت میں یکتائے زمانہ تھی۔ اس کے غیر معمولی حسن، تعلیم، تہذیب کا شہرہ تھوڑے ہی دنوں میں ہندوستان میں بھی یورپ کی طرح گونجنے لگا۔ تاجدار مالوہ کو بھی اس کے دیکھنے کا شوق دامنگیر ہوا۔ لیکن ہندوستانی رسم ورواج، شاہی وقار ہر کوشش کے لئے سدِ راہ تھا۔

وجوہات پر مورخین ساکت ہیں۔ لیکن سپہ سالار صاحب نے یورپ کے دستور کے مطابق لڑکی کو دربار میں پیش کیا۔ چنانچہ یہ رسم بڑی عزت و حرمت کے ساتھ ادا ہوئی۔

اس وقت تخت شاہی پر ایک خوش رو نوجوان، متین، ہردلعزیز حکمران متمکن تھا۔ لڑکی کی حسن و ادا، آن بان کا اس پر ایک خاص اثر ہوا۔ جو روز بروز بڑھتا گیا۔ اور آخر کار عشق کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔

حضرت عشق کے عجیب کرشمے ہیں۔ جذبات کی دنیا پر ابتدائے آفرینش سے اب تک یکساں کروفر سے حکمران رہے ہیں۔ اور عجب نہیں کہ ابد تک یہ جاہ و جلال قائم رہے۔ انقلابِ زمانہ ان کے دستور العمل میں تبدیلی پیدا نہ کر سکا۔ آئینی احتجاج و پُرامن مقاومت کو ان کے احکامات کے مقابلہ میں کبھی فروغ نہ ہو سکا۔

نام و نمود، عزت و شرافت، نیک نامی و وقار، مذہب و ملت، شرم و لحاظ رسم ورواج پر جو تباہ کن سو فی صدی ٹیکس ان کے دربار سے لگا دیا گیا ہے۔ اس کے عدم ادائیگی کا خیال تک ان کی رعایا میں پیدا نہیں ہوتا ہے

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

لطف یہ ہے کہ ذرا سی تاخیر و تساہل میں ٹیکس نامنظور کر دیا جاتا ہے اور تاوان میں جانِ عزیز نذر کرنی پڑتی ہے۔

ایک خودسر ایشیائی حکمران کے دل پر حضرت عشق کا تسلط ہونے کے بعد جو نتیجہ ہو سکتا تھا۔ وہی ہوا یعنی ہر دنیاوی وآخرتی خیال کو پسِ پشت ڈال کر شاہ موصوف کی طرف سے لڑکی سے شادی کا پیام دیا گیا۔

جنرل صاحب اور ان کے اعزا نے اس تقریب کو باعث افتخار اور اپنی عزت ووقار کا زینہ تصور کر کے منظور کر لیا۔

لڑکی بے چاری نے بہتیرا انکار کیا۔ فقدانِ محبت کا عذر کیا۔ انواع واقسام کے حیلے تراشے، خودکشی کا ارادہ کیا۔ لیکن کوئی تدبیر والدین کے خودغرضانہ احکام کے مقابلہ میں چارہ گر نہ ہوئی۔ بالآخر شادی ہوگئی۔ اور صاحبزادی صاحبہ ملکۂ مالوہ بن کر محل میں داخل ہوگئیں۔ ملکہ کے دل میں بچپن سے پرائیویٹ سیکرٹری کی محبت تھی۔ جو ان کے خاندان کے ساتھ وطن سے ہندوستان آیا تھا۔ پرائیویٹ سیکرٹری بھی جذبۂ محبت میں چور تھا۔ چنانچہ اسی جذبہ کی تحت میں ترکِ وطن کر کے جنرل صاحب کے خاندان کے ساتھ ہندوستان آیا تھا۔

قانونِ قدرت میں عجیب لچک ہے۔ معاشرتی اور سوشل قوانین اُسے ایسا دبا لیتے ہیں۔ کہ ظاہر بین حضرات مصنوعی قوانین ہی کو قانونِ قدرت تصور کرنے لگتے ہیں۔

شادی کے رسوم جنہوں نے مختلف اقوام اور ممالک میں مختلف صورتیں اختیار کر لی ہیں۔ زوجین کے درمیان محبت اور عشق کے ضامن قرار دیئے جاتے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ ایک غلطی ہے جس کے تحت میں جنرل صاحب نے شادی رچا دی تھی۔ انہیں امید تھی۔ کہ لڑکی کا انکار تھوڑے ہی دنوں میں

خوش آئند اقرار میں تبدیل ہو جائے گا۔ سپاہی منش جنرل کو معلوم نہ تھا۔ کہ عشق کی آگ نہ ارادتاً لگائے سے لگتی ہے۔ اور نہ بجھائے سے بجھ سکتی ہے ؂

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

بالآخر قانون قدرت مصنوعی بار کو گرا کر اصلی صورت اختیار کر لیتا ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کچھ عرصہ تک دونوں عشاق مصائب ہجر برداشت کرتے رہے۔ روح فرسا تکالیف نے وصال کے ذرائع تلاش کرنے پر مجبور کیا ملکہ نے اپنی سہیلیوں میں چند کو منتخب کر کے اپنا رازدار بنا لیا۔ نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اس سلسلہ نے ترقی کی اور پوشیدہ ملاقاتیں ہونے لگیں۔

ہر ملاقات کے بعد خوف و ہراس و احتیاط میں حسب معمول کمی ہونے لگی دنیا کا بھی عجیب دستور ہے۔ کہ انسان ایسے افعال پر مجبور ہو جاتا ہے جن کو چھپانے کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ فریقین اپنے نزدیک ہر ممکن تدبیر سے اپنی باتیں پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن انہیں افعال کو زمانہ بہ بانگ دہل مشتہر کر دیتا ہے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ ایسے حرکات چھپ سکیں تھوڑے ہی دنوں میں سارے شہر میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ اور یہ خبر رفتہ رفتہ بادشاہ تک پہنچ گئی۔ اس کے غیض و غضب کی کوئی انتہا نہ تھی مگر ضبط و تحمل سے کام لے کر خفیہ تحقیقات شروع کر دی

مگر واقعات اس منزل تک پہنچ چکے تھے۔ کہ جن کا چھپانا غیر ممکن تھا۔ ملکہ کے رازداروں اور سہیلیوں نے سارا راز فاش کر دیا۔ خطوط پیش ہو گئے ملکہ حراست میں لے لی گئی۔

بالآخر جنرل صاحب کی موجودگی میں ثبوت پیش ہوئے اور ملکہ کو اقبال جرم کرنا پڑا۔

سزا کی تجویز بادشاہ کے رحم پر چھوڑ دی گئی۔

انسانی خصلت نے خود غرضی و چاپلوسی کی بدولت بادشاہ و راجے کے نام کے ساتھ انواع و اقسام کی بعید از قیاس روائیتیں وابستہ کر دی ہیں مثلاً بادشاہ ظل اللہ اور راجہ بھگوان کا روپ سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی بیویوں اور رانیوں کو دیویوں اور رعایا کی ماؤں کا رتبہ عطا کیا گیا ہے۔

جن ممالک میں بادشاہ یا راجہ بالکل مطلق العنان ہوتے ہیں وہاں کسی قانون و ضابطہ کی ضرورت ہی نہیں ہوتی غیظ و غضب جو طریقہ ایجاد کرتا تھا اس کے مطابق مجرموں کو سزا دی جاتی تھی۔

بادشاہ نے اپنا وحشیانہ فیصلہ سنایا۔ کہ ملکہ دیوار میں زندہ چن دی جائیں چنانچہ وہ قید خانے سے نکالی گئیں۔

سپہ سالار صاحب یعنی ملکہ کے والد بدنامی ذلت و رنج کے باعث مستعفی ہو کر اپنے متعلقین کے ساتھ وطن چلے گئے۔ اس جانکاہ واقعہ کی یادگار ملکہ کے ہاتھ کا ایک مرصع طلائی کڑا اب تک اس کے خاندان میں موجود ہے۔ جس وقت گرفتاری کا غیر متوقع حکم جاری ہوا ملکہ بے چاری کو یکبارگی تیار ہونا پڑا تھا عجلت و گھبراہٹ میں ایک ہاتھ میں کڑا پہننا بھول گئی۔ چنانچہ یہی والدین کے یہاں رہ گیا

کڑہ کا نام دیکھتے ہی ان کو یاد آگیا۔ کہ وہ نازنین جس نے ان حضرت کو جگایا۔ اور غار میں ساتھ لے گئی تھی۔ صرف ایک ہی مرصع کڑا بائیں کلائی پر پہنے ہوئے تھی۔ داہنی کلائی اس کے جوڑے سے خالی تھی۔

مندرجہ بالا مضمون کو پڑھ کر صاحب بہادر کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوا۔ اور معمہ سلجھانے کی امید از سر نو تازہ ہو گئی۔ ان کو کڑہ دیکھنے اور اس کاغذ کو پڑھنے کا شوق دامنگیر ہوا۔ جس کو انہوں نے پھاڑ کر غار میں پھینک دیا تھا۔ ایک یوروپین جس نے علمی دنیا میں پرورش پائی ہو اس طرح کے خیال کے پیدا ہونے کے بعد کیسے چپکا بیٹھ سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے فوراً سفر کا عزم کر دیا اور انگلستان روانہ ہو کر فرانس پہنچے،

سپہ سالار یعنی سابق جنرل صاحب مالوتا کے مکان پر گئے اور پورے حالات دریافت کئے۔ جو مضمون انہوں نے تاریخ مالوتا میں پڑھا تھا۔ اس کی لفظ بہ لفظ تصدیق ہو گئی۔ اس کڑہ کا بھی معائنہ کیا۔ جو اس خاندان میں بطور یادگار عظم محفوظ ہے۔ دیکھتے ہی فوراً ان کو دوسرا کڑہ جو انہوں نے نازنین کی کلائی پر دیکھا تھا۔ یاد آ گیا۔

دونوں کڑوں میں اتنی مشابہت تھی۔ کہ ایک دوسرے کا یقیناً جوڑ تھا۔

فرانس سے صاحب بہادر ہندوستان آئے اور پھر مالوتا کی اس کوٹھی میں مقیم ہوئے۔ جہاں سے درد سر اور ہیجان روح مول لیا تھا۔

اس معمہ کے انکشاف کی امید نے اور امتداد زمانہ ان کی دماغی حالت کو ایک حد تک درست اصلاح کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اب ان کی حالت کسی قدر درست تھی۔ اور حواس قابو میں تھے۔ غار کی تجسس اور تلاش ترتیب کے ساتھ کی گئی۔ بالآخر اس کا پتہ لگ گیا۔

اس جگہ پر پہنچ کر جہاں یہ کاغذ پھاڑ کے پھینکا تھا ٹکڑوں کی تلاش ہوئی

اور ان کو جمع کر لیا گیا۔ کوٹھی میں واپس آکر ایک دوسرے کاغذ پر چپکا کر پڑھنے کی کوشش کی گئی۔ صاف طریقہ پر معلوم ہوگیا۔ کہ وہ فرانسیسی زبان میں ایک دل گرفتہ عاشق کا اپنے معشوق کے نام پیمان وفا ہے۔

راز و نیاز اور بے پایاں محبت کے اظہار کے بعد تحریر تھا۔ کہ اگر کبھی واقعاتِ زمانہ ایسا پلٹا کھائیں۔ کہ محبت کی شورا شوری میں کمی ہو جائے یا قطع محبت کی غیر ممکن اور غیر متوقع صورت رونما ہو۔ تو یہ محبت نامہ محبوب کاتب کو واپس کر دے۔ تاکہ وہ اسے پھاڑ ڈالے۔

اس مضمون سے واقفیت کے بعد صاحب بہادر نے اپنے خیال میں سارے معمہ کو حل کر لیا۔

ان کی رائے میں غار وہی جگہ تھی۔ جہاں وہ نازنین جیتے جی دیوار میں چن دی گئی تھی۔ جس ہڈی پر یہ خط رکھا ہوا تھا۔ وہ درحقیقت نازنین کے سینہ کی ہڈی تھی۔ جہاں وہ خط چھپایا گیا تھا۔ صاحب بہادر کی روح اس سکرٹری کی روح ہے۔ جس نے وہ خط تحریر کیا تھا۔ اور جس سے نازنین کو عشق حقیقی تھا۔ اس روح نے تناسخ کے مدارج طے کر کے اب صاحب بہادر کے جسم کا چولا اختیار کیا ہے۔ نازنین کی روح عشق و محبت سے اتنی معمور و مجبور تھی۔ کہ دوسرا لباس اختیار نہ کر سکی۔ اور اپنے وعدہ اور عاشق کے حکم کی تعمیل میں صدیاں بے چینی میں گذار دیں۔

بالآخر عاشق کے ہاتھوں پیمان محبت کا ایفا ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے عاشق کی تکلیف و بے قراری نہ برداشت کر کے معمہ کے حل کرنے میں مدد دی۔ یعنی محض اس نازنین کی روح کی توجہ سے یہ

لائبریری پہنچے۔ تاریخ مالوہ اور اس کے اس جزء کا معائنہ کیا۔ جس نے جملہ حالات کے انکشاف میں مدد دی۔ ؎

وعدہ کو وفا کرتے ہیں۔ یوں عشق کے مجنون
پیمانِ وفا مر کے بھی رسوا نہیں کرتے

(زمانہ) (پریم پاک)

ختم ہوا

عنقریب شائع ہوگا
منشی تیرتھ رام صاحب فیروزپوری کے قلم سے
زبردست ناول
منزل موہوم
عمدہ سفید کاغذ۔ دیدہ زیب گرد پوش قیمت
ملنے کا پتہ:- شیل ساگر جین مالک جین بک سٹال انارکلی لاہور